# تاریخ بطور فکشن اور فکشن بطور تاریخ: ڈراما "ارطغرل غازی" کا تجزیاتی مطالعہ

**(Historicizing Fiction and Fictionalizing History: An Analytical Study of drama "Artughral Ghazi")**

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)


مقالہ نگار:

فضیلت حسین




فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد


جون 2022ء

# تاریخ بطور فکشن اور فکشن بطور تاریخ: ڈراما "ارطغرل غازی" کا تجزیاتی مطالعہ

**(Historicizing Fiction and Fictionalizing History: An Analytical Study of drama "Artughral Ghazi")**


مقالہ نگار:

**فضیلت حسین**


یہ مقالہ

**ایم۔ فل (اردو)**

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

**(اردو زبان و ادب)**

فیکلٹی آف لینگو یجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد


جون 2022ء

# مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان : تاریخ بطور فکشن اور فکشن بطور تاریخ: ڈراما "ارطغرل غازی" کا تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: فضیلت حسین رجسٹریشن نمبر: **MPURD/S20/71**

## ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ اردو زبان و ادب:

**ڈاکٹر عابد حسین سیال** ________________

نگران مقالہ

**پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی** ________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

**بریگیڈئر سید نادر علی** ________________

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: ________________

# اقرار نامہ

میں، فضیلت حسین حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کی (ایم۔فل) اردو سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عابد حسین سیال کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

---

فضیلت حسین

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

# فہرست ابواب

## باب دوم: تاریخی تناظر میں ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کا مطالعہ



## باب سوم: ہیرو کے تصور کی روشنی میں ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کا مطالعہ

## باب چہارم: مجموعی جائزہ، نتائج و سفارشات

# ABSTRACT

History is a difficult and dry subject for a common man, but when it is introduced through a drama or a film, it becomes interesting for him. In this regard, a genre of literature known as 'Historical Fiction' has been popular all over the world. Under this genre, events, culture and social life of the past are presented in an interesting manner by taking real historical events, places and characters and adding fictional and imagined events, places and characters to the plot. From novels to films, plays, theater and video games, it is increasingly used and trended. Thus the anonymous characters of history are being introduced as the famous heroes of the present day.

In this investigation, the drama serial "Ertugrul Ghazi" has been analytically studied in the context of the concepts of historicizing fiction and fictionalizing history. The character of "Ertuğrul" is presented as a hero in the play who is one of the founders of the Ottoman Empire. According to Ottoman traditions, Ertugrul was the son of Osman I, the founder of the Ottoman Empire. Apart from this, information about them is negligible. On the contrary, the popularity and acceptance of this play as a historical fiction today is that the Islamic world considers this character "Ertugrul" as their hero. People love Ertugrul and consider him as an unforgettable character of their proud history.

This research consists of the historical and analytical study of the Urdu dubbing of the drama serial "Ertugrul Ghazi", while the analytical study of its main character Ertugrul in the context of the concepts of the hero is also part of the research.

// اظہارِ تشکر

مقالہ لکھنا ایک سنجیدہ اور مشکل کام ہے۔ لیکن اس مشکل مقالہ نگار ایک خاص اعتماد کی دولت بھی سمیٹتا ہے۔ یہ احساس اس کے لیے بہت دلکش ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کے کسی کونے یا اساتذہ کی آہنی الماریوں میں کہیں اس کا نام بھی تخلیق کا، چھوٹا سا ہی سہی مگر شعلہ بن کر دمک رہا ہے۔

مقالہ لکھنے کے لیے خدا پر بھروسہ کرنے اور اپنے والد محترم کی دعاؤں کی ڈھارس میں، جس شخصیت نے قدم بہ قدم میری راہنمائی اور درستی کی وہ میرے استاد محترم اور نگرانِ مقالہ محترم ڈاکٹر عابد حسین سیال ہیں، میں ان کا خصوصیت سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ جس تحمل، شفقت اور خندہ پیشانی سے انہوں نے میرے مقالے میں تہذیب و تسوید کے مراحل طے کروائے وہ قابل ستائش اور لائقِ تقلید ہیں۔ بالخصوص اس وقت جب میرے عزیز از جاں والدِ محترم کی وفات نے میرے لیے زندگی کے امتحان کو بہت کٹھن کر دیا تھا۔

تحقیق کے یہ مراحل تکمیل تک پہنچانے میں جن احباب کا تعاون شاملِ حال رہا ان میں استادِ محترم ڈاکٹر نازیہ یونس کے مفید مشورے اور دوستانہ راہنمائی بھی میرے لیے بہت اہم تھی جس کے لیے میں ان کی شکر گزار ہوں۔ اس سارے عمل میں محترم امجد کلو کا خصوصیت سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں مقالے کا کمپوزنگ کا بار گراں اپنے سر لے کر انہوں نے مجھے جس طرح سبکدوش کیا اس کا شکریہ ادا کرنا مشکل ہے۔ مجھے اپنی پیاری دوست سعدیہ کنول کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جس نے بہت فراخ دلی اور محبت سے تحقیقاتی مراحل میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔

میں شعبہ اُردو نمل کے تمام اساتذہ کرام کی دل سے سپاس گزار ہوں جنہوں نے میرے تعلیمی سیشن کے دوران میں اپنی شفقتوں اور توجہ سے نوازا۔

فضیلت حسین

باب اوّل

# موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

## الف: تمہید

### i۔ موضوع کا تعارف (Introduction)

حالیہ دنوں میں پاکستان کے قومی ٹی وی چینل پی ٹی وی ہوم پر ترکی ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" اردو ڈبنگ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ تیرہویں صدی کے شان دار مسلم دور کی عکاسی کرنے والے اس ڈرامے کا مرکزی کردار "ارطغرل" ہے جو اس ڈرامے کا روح ورواں ہے۔ اگرچہ یہ ڈراما سلطنتِ عثمانیہ کے تناظر میں لکھا گیا ہے تاہم اس کے بہت سے کردار بالخصوص ارطغرل اور اس میں پیش کیے گئے واقعات تاریخی اعتبار سے نہ صرف مستند نہیں ہیں بلکہ ان کی تاریخ میں موجودگی پر بھی شکوک وشبہات ہیں۔ تاہم اس ڈرامے کی پیش کش اس قدر متاثر کن ہے کہ غیر مستند اور غیر حقیقی کرداروں پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ اس کی شہرت ومقبولیت کے جہاں کچھ اور اسباب ہیں وہیں ایک وجہ یہ ہے کہ عام ٹی وی ناظر اسے تخلیقی نہیں بلکہ تاریخی واقعات اور کرداروں پر مبنی ایک حقیقی ڈراما سمجھتا ہے۔

تاریخ اور فکشن جداگانہ مضامین ہیں تاہم واقعات کا بیان دونوں میں قدرِ مشترک ہے۔ تاریخ کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ماضی کے حقیقی واقعات سے سروکار رکھتی ہے جبکہ فکشن کے لیے حقائق کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ فکشن تاریخ کے برعکس تخیلی اور تخلیقی واقعات پر مبنی ہوتا ہے۔ یہی فرق دونوں کو ایک فاصلے پر رکھتا ہے۔ تحقیق کے مجوزہ موضوع کے تحت فکشن اور تاریخ کے رشتے کے باہمی ارتباط کو سمجھتے ہوئے ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔

### ii۔ بیان مسئلہ (Problem Statement)

تاریخ ایک عام آدمی کے لیے مشکل اور خشک مضمون ہوتا ہے لیکن اسے ڈراما یا فلم کے ذریعے متعارف کروایا جائے تو یہ اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ اس حوالے سے ادب کی ایک صنف دنیا بھر میں مقبول رہی ہے جسے 'تاریخی فکشن' (Historical Fiction) کہا جاتا ہے۔ اس صنف کے تحت حقیقی تاریخی واقعات،

مقامات اور کرداروں کو لے کر پلاٹ میں تخیلی اور تصوراتی واقعات، مقامات اور کرداروں کا اضافہ کر کے، ماضی کے واقعات، ثقافت اور سماجی زندگی کو دلچسپ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ناول سے لے کر فلم، ڈرامے، تھیٹر اور ویڈیو گیمز تک میں اس کا استعمال اور رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ یوں تاریخ کے گمنام کرداروں کو موجودہ دور کے نامور ہیرو کے طور پر متعارف کرایا جا رہا ہے۔

زیرِ تحقیق موضوع کے تحت ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کا تاریخ بطور فکشن اور فکشن بطور تاریخ کے تصورات کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ "ارطغرل" کا کردار ڈرامے میں ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کا تعلق سلطنتِ عثمانیہ کے بانیوں میں سے ہے۔ عثمانی روایات کے مطابق ارطغرل سلطنتِ عثمانیہ کے بانی عثمان اوّل کے بیٹے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کے برعکس آج تاریخی فکشن کے طور پر اس ڈرامے کی مقبولیت و پذیرائی کا یہ عالم ہے کہ عالمِ اسلام اس کردار "ارطغرل" کو اپنا ہیرو مانتا ہے۔ لوگ ارطغرل سے پیار کرتے ہیں اور اسے اپنی قابلِ فخر تاریخ کا ناقابلِ فراموش کردار مانتے ہیں۔ مجوزہ تحقیق ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کے اردو روپ کے تاریخی و تحقیقی تجزیے پر مشتمل ہے جبکہ اس کے مرکزی کردار ارطغرل کا ہیرو کے تصورات کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ بھی مجوزہ موضوعِ تحقیق کا حصہ ہے۔

### iii۔ مقاصد تحقیق (Research Objectives)

1۔ فکشن اور تاریخ کے مفاہیم کو سمجھتے ہوئے دونوں میں اشتراک و افتراق کی نوعیت کا جائزہ لینا۔

2۔ ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" میں پیش کردہ واقعات کی تاریخی حیثیت اور نوعیت کا جائزہ لے کر تاریخ اور فکشن کے باہمی ارتباط و اختلاف کا تجزیہ کرنا

3۔ تاریخی فکشن میں تصورِ ہیرو کے تناظر میں ڈرامے کے مرکزی کردار "ارطغرل" کا تنقیدی مطالعہ کرنا۔

### iv۔ تحقیقی سوالات (Research Questions)

مجوزہ تحقیقی مقالے کے لیے درج ذیل سوالات کو مدِ نظر رکھا گیا ہے:

1۔ تاریخی فکشن کے تصورات کی روشنی میں سلطنت عثمانیہ کی تاریخ میں ارطغرل کے واقعات اور ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" میں پیش کردہ واقعات میں مماثلت اور اختلافات کی نوعیتیں کیا ہیں

اور آرٹ اور ادب کے نقطہ نظر سے ان سے کیا مقاصد حاصل کیے گئے ہیں؟

2۔ تاریخی ہیرو اور فکشن کے ہیرو کے تصورات کی روشنی میں ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" میں پیش کیا گیا ارطغرل کا کردار کس حد تک تاریخی ہیرو کے تصور پر پورا اترتا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار (Theoretical Framework)

مجوزہ تحقیقی کام تاریخ بطور فکشن اور فکشن بطور تاریخ کے تناظر میں ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کے تجزیاتی مطالعے پر مبنی ہے۔ اس تحقیق کے دوران یہ دیکھا گیا ہے کہ تاریخ اور فکشن کے بنیادی خصائص و وظائف کیا ہیں۔ آیا یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں یا ان میں کوئی ارتباط بھی موجود ہے؟ کیا تاریخی حقائق واقعتاً حقائق پر مبنی ہوتے ہیں یا تاریخ کی اسناد پر بھی سوال اٹھایا جا سکتا ہے؟

تاریخی واقعات یا کرداروں کو فکشن کے ذریعے پیش کیا جائے تو یہ عوامی سطح پر بہت پذیرائی پاتے ہیں۔ تاریخی واقعات و کردار کو نئی صورت میں تخلیق کرنا یقیناً ایک مشکل کام ہے۔ فی زمانہ یہ صورتِ حال یعنی تاریخ کو فکشن (فلم یا ڈرامے) کی شکل دینا بہت مقبول ہو رہی ہے جسے تاریخی فکشن کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں تاریخی واقعات، مقامات اور کرداروں کا اضافہ کر کے یا پھر تاریخ کے کسی منظر نامے پر کوئی ایک تخلیقی کردار پیش کر کے ماضی کے واقعات، ثقافت اور سماجی زندگی کو دلچسپ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ناول سے لے کر فلم، ڈرامے، تھیٹر اور ویڈیو گیمز تک میں اس کا استعمال بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

مغرب میں اس صنف کا استعمال بہت پرانا ہے۔ مغربی اقوام نہ صرف اپنی تاریخ کا از سرِ نو احیا اس کے توسط سے کرتی ہیں بلکہ اپنی تاریخ اور تاریخی کرداروں کو زندہ رکھنا اور انھیں نئی نسل تک منتقل کرنے کے لیے ایک بڑے وسیلے کے علاوہ دوسری اقوام بالخصوص حریف اقوام کو بدنام کرنے کے لیے بھی اس صنف کا استعمال شدومد سے کیا جاتا ہے۔ تاریخ کی ایک تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ یہ عظیم لوگوں کی داستان ہے۔[1] اس حوالے سے تاریخ میں ہیرو کا تصور اور تاریخی فکشن میں ہیرو کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈراما سیریل ارطغرل غازی میں "ارطغرل" کے کردار کا تاریخی فکشن کے ہیرو کے طور پر اس کا جائزہ تحقیق کا حصہ ہے۔

دورانِ تحقیق 'تاریخی فکشن' اور 'تصورِ ہیرو" کے نظریات کو نظری دائرہ کار کے طور پر لیا گیا ہے۔

### vi۔ تحقیقی طریق کار (Research Methodology)

تحقیقی طریق کار میں پہلے مرحلے پر تاریخ اور فکشن کے مفاہیم اور باہمی ارتباط سے آگہی حاصل کی گئی ہے۔ تاریخ ایک علم ہے جبکہ فکشن (ڈراما) ایک عمل۔ دونوں کے مفاہیم کا ادراک اور دونوں کے خصائص کا جائزہ مجوزہ موضوع کے تناظر میں لیا گیا ہے۔

دوسرے مرحلے میں تاریخی فکشن کا، جس کے تحت تاریخ کو بطور فکشن کے پیش کیا جاتا ہے، مطالعہ کیا گیا ہے اور دونوں میں ارتباط و تفاوت کی نوعیت بیان کی گئی ہے۔ یہ مرحلہ استقرائی طریق تحقیق کے تحت مکمل کیا گیا ہے۔ علمِ تاریخ کی بنیادی کتب سے، جن میں تاریخِ ابنِ خلدون بھی شامل ہے،[2] علمِ تاریخ کو سمجھنے میں مدد لی گئی ہے۔

مجوزہ موضوع چونکہ تاریخی فکشن کے تحت ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ اس کا مرکزی کردار "ارطغرل" ہے جو سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان اول کا باپ تھا۔ تاریخ میں اس کا کردار اور سلطنتِ عثمانیہ کی بنیادیں رکھنے میں اس کا کیا کردار تھا اور اسے ڈرامے میں کس طرح پیش کیا گیا ہے، ان سوالوں کے جوابات کے لیے سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ اور ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی حوالہ کیرولین فنکل کی کتاب "عثمان کا خواب" (Osman's Dream)[3] ہے جس میں انھوں نے سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ پر تحقیقی بحث کی ہے۔ یہ کتاب 2005 میں شائع ہوئی۔ یوں دوسرے مرحلے میں تقابلی تحقیق کے تحت موضوع کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے مرحلے میں تاریخ اور فکشن میں ہیرو کے تصور سے بنیادی آگاہی حاصل کی گئی ہے۔ اردو میں تاریخی فکشن اور تاریخی ڈرامے کی ایک مضبوط روایت موجود ہے، ان کا مطالعہ بھی دورانِ تحقیق مددگار ثابت ہوئی۔ ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کے کردار ارطغرل کا تاریخ کی روشنی میں جائزہ لے کر بطور فکشن ہیرو اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

### vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق: (Work Already Done)

مجوزہ تحقیقی موضوع جو کہ ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کے تناظر میں ہے۔ اس سے قبل اس قسم اور نوعیت کا رسمی اور غیر رسمی کسی بھی سطح کا تحقیقی و تنقیدی کام نہیں کیا گیا البتہ ڈرامے کی مقبولیت کے پیش نظر وقتاً

فوقتاً چند مختصر تحریریں اخبارات میں شائع ہوئیں جن میں روزنامہ جنگ میں انصار عباسی [4] اور آمنہ مفتی [5] کے کالم براہِ راست اس ڈرامے سے متعلق ہیں۔ جن میں اس ڈرامے کی پسندیدگی اور مقبولیت کے اسباب کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔

viii۔ تحدید: (Delimitation)

ڈراما سیریل ارطغرل غازی (دیریلش ارطغرل) جمہوریہ ترکی میں سرکاری ٹی وی چینل ٹی آر ٹی 1 پر نشر ہونے والا ڈراما سیریل ہے جس کی مقبولیت کی وجہ سے یہ کئی ممالک میں ترجمے کے ساتھ دکھایا جارہا ہے۔ اس ڈرامے کے پانچ سیزن اور ایک سو پچاس اقساط ہیں اور کرداروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ تاہم اس کا مرکزی کردار "ارطغرل" ہی ہماری تحقیق کا بنیادی موضوع ہے۔ ترکی کے دوسرے ڈرامے یا ان کے کردار اس تحقیق کا حصہ نہیں ہیں۔ ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" میں پیش کیے گئے تاریخی واقعات اور ڈرامے کا ہیرو ارطغرل تحقیق کے بنیادی موضوعات ہیں جن کا مطالعہ تاریخی فکشن اور فکشن میں ہیرو کے تصورات کے تحت کیا گیا ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ: (Literature Review)

تاریخ اور فکشن کے بنیادی وظائف سے متعلق کتب پس منظری مطالعے میں شامل رہی ہیں جن کی تفصیل کتابیات میں فراہم کی گئی ہے۔ عالمی سطح پر ڈرامے اور فلمیں بھی تاریخی فکشن کی تفہیم کے لیے مددگار رہی ہیں۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں فلم "گلیڈی ایٹر" بے حد مقبول ہوئی جسے آسکر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔[6] یہ فلم تاریخی حقائق پر نہیں بلکہ تاریخی افسانے پر مبنی تھی۔ اس فلم کا ہیرو ایک ہسپانوی سپہ سالار دکھایا گیا تھا جو قطعی طور پر فرضی تھا۔ تاریخی فکشن میں مصنف کے پاس آزادی ہوتی ہے کہ وہ اصل کے ساتھ جو چاہے اضافہ کر سکتا ہے مگر عام قاری یا ناظر تاریخ اور فکشن کے فرق کو محسوس کرنے یا سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے اور فکشن کو پورا سچ مان لیتا ہے۔ ہالی وُڈ نے اس صنف کو بڑی بے باکی سے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا۔ اردو میں انارکلی کا کردار اور ڈراما اس کی بڑی مثال ہے۔[7] امتیاز علی تاج کے واضح کرنے کے باوجود کہ یہ اصل تاریخی کردار نہیں ہے، اکثریت اسے حقیقت کی طرح مانتی ہے۔ فردوس بریں میں علی وجودی کا کردار بھی اس کی ایک اہم مثال ہے۔[8] حسن بن صباح کے تاریخی کردار اور فردوس بریں کے علی وجودی میں مماثلتیں اور اختلافات تاریخی فکشن کے تناظر میں اچھے مطالعے کا سامان ہیں۔ نسیم حجازی کے ناول جن میں سے چند ایک کی ڈرامائی تشکیل بھی کی گئی اور وہ پی

ٹی وی سے نشر ہو کر مقبولیت کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے، اس حوالے سے مطالعے کا حصہ رہے ہیں۔

x۔ تحقیق کی اہمیت:(Significance of Research)

ترکی ڈرامے گذشتہ کچھ عرصے سے پاکستان میں ٹیلی ویژن ناظرین میں بالخصوص مقبول ہو رہے ہیں مگر جو پذیرائی اور مقبولیت "ارطغرل غازی" کے حصے میں آئی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہ پاکستان کے علاوہ کئی ممالک میں ترجمہ کے ساتھ دکھایا گیا اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ تاہم ابھی تک علمی و تحقیقی حلقوں کی جانب سے اس پر کوئی قابل ذکر کام سامنے نہیں آیا تھا اس تحقیقی کام کے ذریعے:

- ادب میں ایک کم یاب طرز کے مطالعے کا رجحان سامنے آیا ہے۔
- ڈرامے کے کردار کی تفہیم و تعبیر ایک نئے زاویے سے ہونے کے باعث معاصر ادب پر اس کا مثبت اثر پڑنے کا امکان ہے۔
- فکشن اور تاریخ کے ایک دوسرے پر اثرات کا جائزہ لینے اور اس سے فی زمانہ ڈرامے کی صنف کی مقبولیت کی تفہیم کا دریچہ وا ہوا ہے۔

## ب: ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کا تعارف

### i۔ ڈرامانویس کا تعارف

کسی بھی تخلیق کی کامیابی کے پیچھے دراصل اس کے تخلیق کار کا نظریہ، اس کی کہانی میں اس نظریے کی بھرپور اور موثر انداز میں پیش کش ہر طرح سے اہم ہوتی ہے۔ ارطغرل غازی کو بین الاقوامی بالخصوص عالم اسلام میں جو مقبولیت و شہرت اور پذیرائی ملی ہے، وہ محض اس لیے نہیں کہ یہ ڈراما اپنی کاسٹ اور پیش کش میں اپنی مثال آپ ہے بلکہ ڈرامے کی کہانی جو دراصل عالم اسلام کو ایک پیغام ہے کہ اتحاد اور یگانگت کے ساتھ ساتھ اسلام کے سنہرے قوانین پر عمل پیرا ہونا ہی مسلمانوں کے لیے راہ نجات بن سکتا ہے۔ ماضی کے مسلمانوں نے کس طرح مشکلات پر قابو پایا، متحد رہے سخت جدوجہد کی اور اسلام کا بول بالا کیا۔ اس کے نتیجے میں اللہ نے انہیں عزت و شہرت سے نوازا اور وہ معمولی چرواہوں سے جہاں گیر و جہاں بان و جہاں آرا بن گئے۔

ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کے مصنف مہت بوز داغ (ترکی میں محمد کو مہت لکھتے ہیں) ہیں۔ جن کا

تعلق ترکی کے ایک علاقے قیصری سے ہے۔ ان کا تعلق ایک مذہبی خاندان سے ہے۔ ان کے دادا پیش امام تھے، چچا مذہبی علوم کے ماہر اور والدہ مذہب سے خصوصی لگاؤ رکھتی ہیں۔ خود مہمت بوز داغ نے ترکی کی اسکاریہ یونیورسٹی (Sakarya University) سے تاریخ میں ڈگری حاصل کی۔ وہ بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق رکھتے تھے ساتھ ہی دادا کی معیت میں روزانہ مسجد جاتے، قرآن کی تلاوت سنتے اور اس کا اثر قبول کرتے۔ رفتہ رفتہ قرآنی آیات ان کا سرمایہ حیات بن گئیں اور بقول ان کے بچپن سے لے کر اب تک انہوں نے قرآن پاک کی قرات کبھی نہیں چھوڑی اور قرآنی آیات کو دہراتے رہنا ان کے معمول میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈرامے کے مختلف مناظر میں ہمیں قرآن پاک کی آیات اور احادیث نبوی ﷺ کے حوالے جابجا نظر آتے ہیں۔[9]

بوزداغ نے محض بیس اکیس سال کی عمر میں ایک دوست کے ساتھ مل کر ایک میڈیا کمپنی بنائی اور پھر اس کے توسط سے دستاویزی فلمیں بنانے کا کام شروع کر دیا۔ بالخصوص سلطنت عثمانیہ کا قیام اور عروج سے متعلق کئی دستاویزی فلمیں بنائیں اور چھبیس سال کی عمر میں انہوں نے اپنی ایک الگ فرم قائم کر لی جس میں مختلف موضوعات کے تحت فلمیں بناتے رہے۔ 2015ء میں ارطغرل غازی بناتے وقت ان کی عمر (29) انیتس سال تھی۔ تاریخ بالخصوص اسلامی تاریخ ان کی دلچسپی اور مہارت کے شعبے ہیں۔ مشہور ڈراما سیریل یونس ایمرے (Younus Emry) بھی ان کے قلم سے تخلیق ہوا۔[10]

ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" تقریباً چھ سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ ایک سال تو ڈرامے کی کاسٹ کی ٹریننگ کی گئی۔ جس کے لیے باقاعدہ انہیں تاریخی کتابیں پڑھنے کو دی جاتیں تاکہ اداکار اس زمانے کی تہذیب، ثقافت اور رسم ورواج سے واقفیت حاصل کریں۔ چوں کہ اس سے قبل ترکی میں کبھی اس طرح کے ڈرامے نہیں بنائے گئے جن میں جنگ وجدل کے مناظر، گھڑ سواری، تلوار بازی اور نیزہ بازی وغیرہ کے سین ہوں۔ لہٰذا مہمت بوزداغ نے کہانی لکھنے کے بعد منگولیا سے ایک مصور کو بالخصوص بلوایا تاکہ وہ اس ساری کہانی کو تصویری شکل دے سکیں۔ قازقستان سے گھوڑے منگوائے گئے اور انہیں باقاعدہ تربیت دی گئی۔ ڈرامے کے لیے منتخب شدہ اداکاروں کی تربیت کے لیے بھی ایک کیمپ ترتیب دیا گیا۔

مہمت بوزداغ مسلمان مفکرین میں ابن عربی سے بے حد متاثر ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر فرقان حمید کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ وہ اس ڈرامے کے ذریعے سے نئی نسل کو تاریخ اسلام اور دینِ اسلام سے روشناس کروانا چاہتے

ہیں۔ ان کے مطابق تیرہویں صدی میں عالم اسلام کو جن مشکلات اور سازشوں کا سامنا تھا، کم و بیش موجودہ دور میں بھی اسلام اور اہل اسلام کو وہی خطرات پیش ہیں۔[11] عظمتِ رفتہ کی عظیم اور ایمان افروز یادوں کو تازہ کرنا اس ڈرامے میں خاص طور سے ان کے پیش نظر رہا تاکہ نوجوان نسل اپنے ماضی سے آگہی حاصل کریں کہ کس طرح ان کے بزرگوں نے ان مشکلات پر قابو پا کر عظیم سلطنت عثمانیہ کی بنیادیں استوار کیں۔ اسی انٹرویو میں انہوں نے ڈاکٹر فرقان حمید سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے ایک رات مشہور اسلامی مفکر و محقق ابن عربی کو اپنے خواب میں دیکھا اور پھر اس کے بعد ان کی زندگی کا رخ ہی تبدیل ہو گیا۔ وہ باقاعدہ طور پر لکھنے لگے اور اسلامی دور کے حوالے سے ڈرامے تیار کرنے پر بہت توجہ کرنے لگے۔

انہوں نے بتایا کہ یہ ڈراما دراصل ان کے اندر کی دنیا ہے۔ وہ عظمتِ رفتہ کے زمانے کو مثالیہ بناتے ہیں اور ان کی شدید خواہش ہے کہ مسلمان پھر سے اپنا وہی مقام حاصل کریں جب وہ اقوام عالم میں نمایاں ترین قوم کے مقام و مرتبے پر فائز تھے۔ عالم اسلام کی صفحہ عالم پر مرکزیت قائم ہو اور وہی عظیم دور ایک بار پھر حقیقت بن کر سامنے آئے۔

**ii**۔ ڈرامے کا خلاصہ

زیر تحقیق ڈرامے کا تعلق جمہوریہ ترکی سے ہے۔ اس تاریخی ڈرامے کے ڈانڈے سلطنتِ عثمانیہ کے آغاز سے جوڑے جاتے ہیں۔ ڈرامے کا زمانہ تیرہویں صدی کا ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن نے اسے ڈبنگ کے ذریے اردو فہم طبقے بالخصوص پاکستانی ناظرین کے لیے پیش کیا۔ اور اس ڈرامے کا تعارف ان الفاظ میں پیش کیا:

> "ارطغرل غازی تیرہویں صدی کے اناطولیہ (ترکی) کی تاریخ سے ماخوذ ایک عظیم الشان داستان ہے۔ ایمان، انصاف اور محبت کی روشنائی سے لکھی ایک بہادر جنگجو کی کہانی جس نے اپنی ثابت قدمی اور جرات سے نہ صرف اپنے قبیلے بلکہ تمام عالم اسلام کی تقدیر بدل ڈالی۔ اوغوز ترکوں کے خانہ بدوش قائی قبیلے کو ایک ایسے وطن کی تلاش تھی جہاں ان کی نسلیں پروان چڑھ سکیں۔ قائی قبیلے کے سردار سلیمان شاہ کے بیٹے ارطغرل غازی نے اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنی جان ومال اور عزیز و اقارب کو خطرے میں ڈال کر اپنے جنگجوؤں کے ساتھ مختلف ادوار میں صلیبیوں، منگولوں سلجوق سلطنت میں موجود غداروں اور دیگر

اسلام دشمن عناصر کو شکست دی۔ 1280 میں ارطغرل غازی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے عثمان نے عظیم سلطنت عثمانیہ کی داغ بیل ڈالی اور یوں خانہ بدوشوں کے اس قبیلے نے تین براعظموں پر چھ سو سال تک حکومت کی۔ یہ ڈراما سیریل تاریخی کرداروں اور واقعات سے ماخوذ ہے"۔[12]

سو اس تاریخی پس منظر میں لکھے گئے ڈرامے کا روح و رواں ارطغرل ہے۔ اس کا عہد 1230 سے 1281 تک کا تھا۔ ارطغرل، قائی نام کے ایک خانہ بدوش قبیلے کے سردار سلیمان شاہ کا بیٹا ہے۔ یہ ڈرامانہ صرف اپنی کہانی بلکہ اپنی پیشکش اور کرداروں کے اعتبار سے ایک شاہکار ہے۔ یہ پورا ڈراما دراصل قائی قبیلے کے اتار چڑھاؤ کی کہانی ہے جو ایک ایسا قبیلہ ہے جو ہمہ وقت جنگ کے لیے تیار رہتا ہے۔ روح اسلام سے سرشار یہ جنگجو قبیلہ ایک طرف موسموں کی شدت کے درمیان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے تو دوسری طرف منگول، صلیبی اور اندرونی دشمنوں سے برسرِپیکار ہے۔

کہانی کے آغاز میں ہم دیکھتے ہیں کہ قائی قبیلے کے سردار سلیمان شاہ کو سردی کے سخت موسم سے بچاؤ اور قحط کے پیشِ نظر ایک خطہ زمین درکار ہے۔ جس کے لیے وہ امیر حلب کو اپنے بیٹے کے ذریعے درخواست بھیجتا ہے۔ مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ قبیلہ ایک شان دار اور ناقابل شکست سلطنت کی بنیادیں اٹھانے والا قبیلہ بن جاتا ہے۔

تیرہویں صدی کا زمانہ ہے، قائی قبیلہ ہجرت کر رہا ہے۔ قحط کی مشکلات اور منگولوں اور صلیبیوں کے متوقع حملے سے بچاؤ کے لیے 400 خیموں پر مشتمل یہ چھوٹا سا قبیلہ ایک ایسی جگہ کا متلاشی ہے جہاں وہ پرامن طور پر رہ سکیں۔ سلیمان شاہ اس قبیلے کا سردار ہے۔ اس کے چار بیٹے: گندوز، سنگور تیگن، ارطغرل اور دوندار ہیں۔ سنگور تیگن منگولوں کے حملے میں ان کی قید میں چلا جاتا ہے۔ مگر عام تاثر یہ ہے کہ وہ شہید کر دیا گیا ہے۔ ارطغرل منجھلا بیٹا ہے۔ باقی بیٹوں کی نسبت ارطغرل پر عزم، مستقل مزاج، نڈر اور سیاسی امور میں زیرک ہے۔ وہ اکثر اپنے دوستوں بامسی، دوغان اور ترگت کے ہمراہ دیکھا جاتا ہے۔ یہ سب مل کر شکار پر جاتے رہتے ہیں۔ ایک بار جنگل میں شکار کرتے ہوئے ان کا سامنا صلیبیوں (ٹیمپلرز) سے ہوتا ہے جو تین قیدیوں کو لے جا رہے ہوتے ہیں۔ قیدی بھاگنے کی کوشش میں ناکام رہے ہیں اور قریب ہے کہ صلیبی ان کی گردنیں اڑا دیں کہ اسی لمحے ارطغرل کا تیر اس

صلیبی کی گردن پر لگتا ہے اور آن کی آن میں ارطغرل اور اس کے ساتھی سارے صلیبیوں کا خاتمہ کر کے ان قیدیوں کو بچا لیتے ہیں۔ یہ قیدی سلجوق سلطنت کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں ایک نوجوان لڑکی حلیمہ سلطان، اس کا باپ شہزادہ نعمان اور کم سن بیٹا الیعیث ہے۔ ارطغرل ان کی شناخت کیے بغیر انہیں اپنے قبیلے لے آتا ہے۔ قیدی اپنی حفاظت کے پیش نظر اپنی شناخت چھپا لیتے ہیں۔ یوں قائیوں پر نئی مصیبت آتی ہے۔ سلجوق سلطنت اس اقدام پر ناراض ہے اور قیدی واپس نہ کرنے کی صورت میں جنگ کی دھمکی دیتی ہے۔ دوسری طرف صلیبی حملہ آور ہو کر نہ صرف بہت سے قائی سپاہیوں کو مار دیتے ہیں بلکہ ترگت کو قید کر کے بدترین اذیت دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ قبیلے میں موجود غداروں کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ سلیمان شاہ کی قیادت کو ان تمام مصائب کا ذمہ دار ٹھہرائیں۔ ارطغرل حلیمہ سلطان کو پسند کرنے لگتا ہے اور دونوں میں محبت ہو جاتی ہے۔ سلیمان شاہ ارطغرل کو امیر حلب کے پاس بھیجتا ہے کہ انہیں اپنے قبیلے کی آبادکاری کے لیے زمین دی جائے۔ جہاں ارطغرل کو پتا چلتا ہے کہ حلب کا محل صلیبی سازشیوں اور مخبروں کی جائے پناہ بن چکا ہے۔ ارطغرل اپنی جواں مردی، ذہانت اور دوستوں کی مدد سے ان تمام کا راز فاش کرتا ہے اور انہیں انجام تک پہنچاتا ہے۔ اسی دوران قبیلے کا غدار کردوغلو بھی سب کے سامنے آجاتا ہے اور ارطغرل کی تلوار اس کا خاتمہ کرتی ہے۔ حلیمہ سلطان اور ارطغرل کی شادی ہو جاتی ہے اور ترگت کو بھی ٹیمپلرز کی قید سے آزاد کروالیا جاتا ہے۔

صلیبی اپنی سازشیں جاری رکھتے ہیں۔ قائی سپاہی سلیمان شاہ کی سربراہی میں ان کے قلعے کو فتح کر کے ان کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ مگر اس کے کچھ ہی عرصے بعد منگولوں کا فتنہ اس قبیلے کا سکون برباد کر دیتا ہے۔ اسی دوران سلیمان شاہ کی وفات ہو جاتی ہے اور وقتی طور پر قائی قبیلے کی سربراہی ان کی بیوہ حائمہ خاتون کے پاس ہے۔ منگول کمانڈر نویان کے ہاتھوں ارطغرل قید ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال میں قائی قبیلہ حائمہ خاتون (سلیمان شاہ کی بیوی) ان کی سربراہی میں دودور گاہ قبیلے میں پناہ لیتا ہے جس کا سردار کورکوت حائمہ خاتون کا بھائی ہے۔ قبیلے پر یہ انتہائی سخت وقت ہے۔ سردار کی وفات ہو چکی ہے۔ ارطغرل منگولوں کی قید میں ہے اور منگولوں نے سارا قبیلہ جلا کر انہیں وہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ تاہم ارطغرل اس قید سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دودور گاہ قبیلے آنے کے بعد ارطغرل کے ماموں زاد بھائی (سردار کورکوت) کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سردار کورکوت کی دوسری بیوی ہے جو دراصل منگول غداروں کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور ارطغرل کو قتل کروا

کے اپنے بھائی گو میتنگین کو سردار بنانا چاہتی ہے۔ اس سارے منصوبے کے پیچھے امیر سعد الدین کوپیک کی سازش ہے جو سلجوق سلطنت کا سب سے بڑا غدار ہے۔ مگر سب اس سے لاعلم ہیں۔ البتہ ارطغرل کی نگاہ مرد شناس اس کا بھانپ لیتی ہے۔ سازشوں میں گھرا ہوا یہ قبیلہ ارطغرل کی سربراہی میں تمام مشکلات پر قابو پا لیتا ہے۔ سردار کورکوت کی بیوی اس کا بھائی جو اس ساری خرابی کی جڑ تھا اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔ اس دوران ارطغرل کا بھائی سنگور تگین طویل گم نامی کے واپس آ جاتا ہے۔ وہ اس دوران سلجوق سلطنت کا مخبر رہا ہوتا ہے اور اپنا راز فاش ہو جانے کے بعد قبیلے چلا آتا ہے۔

دوسرا سیزن شروع ہوتا ہے۔ پہلے سیزن میں قائی قبیلہ اندرونی اور صلیبی دشمنوں کو شکست دیتا ہے اور اب اس قبیلے کا سب سے بڑا دشمن نویان ہے جو کہ منگول فوج کا کمانڈر ہے۔ ارطغرل اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اسے بھی شکست دیتا ہے۔ پے درپے کامیابیوں اور جرات مندی نے ارطغرل کی شہرت سلجوق بادشاہ علاؤالدین کے دربار تک پہنچا دی ہے۔ ابن العربی جو ارطغرل کے روحانی پیشوا ہیں، اسے قرآن و سنت پر عمل پیرا ہونے اور مسلمانوں کو مصیبتوں سے نکالنے کے لیے آگے بڑھتے چلے جانے پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ نویان کو ناکوں چنے چبوا کر قائی قبیلہ اناطولیہ کی مغربی سرحد پر ہجرت کر جاتا ہے۔ مگر ارطغرل کے بھائی اس فیصلے میں اس سے اختلاف کرتے ہیں اور وہ ہجرت نہیں کرتے۔

ہجرت کے بعد ارطغرل اپنے تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ اناطولیہ کے مغربی خطے میں آبادکاری کرتا ہے۔ حائمہ خاتون بھی بعد میں اس قافلے میں شامل ہو جاتی ہیں اور ابن العربی اپنے بہت سے کاریگر اور ہنرمند پیروکاروں کے ساتھ ارطغرل کے لیے باعث تقویت بنتے ہیں۔ یہاں بھی نئے دشمن، نئے چیلنج اور نئے محاذ ارطغرل کے منتظر ہیں جن میں چاودار قبیلے کے سردار کے بیٹے اورال جیسا منافق، گھٹیا اور طاقت ور دشمن سر فہرست ہے۔ چاودار قبیلہ کا سردار جاندار ہے۔ جس کے تین بچے اورال، آلیار اور بیٹی اصلاحان ہیں۔ یہ قبیلہ اس خطے کا تجارتی اعتبار سے سب سے طاقت ور قبیلہ ہے اور اپنے اس فن میں نازاں ہے۔ انہیں یہ بات گوارا نہیں کہ کوئی دوسرا قبیلہ بالخصوص قائی جو کہ نو آباد ہے، ان کی تجارت میں حصہ دار بنے۔ ارطغرل ترک قبائل کے اتحاد کا عزم لیے اس قبیلے سے ہر طرح کا تعاون کرتا ہے تاہم سردار جان دار کا بڑا بیٹا جو انتہائی شیطانی دماغ کا انسان ہے ارطغرل سے ازحد مخاصمت رکھتا ہے۔ وہ لالچی شخص خود کو سردار بنانے کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے

چچا، بھائی اور بہن تک کو قتل کروانے کے منصوبے بناتا ہے۔ ہانلی بازار تجارت کا مرکز ہے جس کی باگ ڈور صلیبیوں کے ہاتھ ہے مگر یہ بات مسلمانوں سے پوشیدہ ہے کیونکہ صلیبی تاجروں کے روپ میں ہیں۔ ارطغرل اپنے آہنی عزم، سیاسی بصیرت اور بہادری کے باعث اس بازار کو صلیبیوں سے بازیاب کرواتا ہے۔ اور اس بازار اور تجارت پر اپنا قبضہ قائم کرتا ہے۔ اورال جو کہ امیر سعد الدین کوپیک کی مدد سے سرداری کے خواب دیکھ رہا ہے، کو ارطغرل کی عدالت کا سامنا ہے۔ اسے ارطغرل کی قالین جلانے، سپاہیوں کو شہید کرنے اور کاراجاحصار قلعے کے گورنر کو قتل کرنے کے جرائم میں سزائے موت سنائی جاتی ہے۔ یہ خبر سنتے ہی اورال کا دیرینہ سال باپ صدمے کے باعث مر جاتا ہے۔ ارطغرل اپنی فطری رحم دلی کے باعث اورال کو جنازے میں شرکت کی اجازت دیتا ہے۔ اورال جیسا بد طینت شخص اس موقع کا خوب فائدہ اٹھاتا ہے اور فرار ہو کر عیسائیوں کے نئے گورنر وسیلوس کے پاس پناہ لے لیتا ہے۔

بعد ازاں امیر سعد الدین کی مدد سے رہا ہو جاتا ہے مگر اسی دوران وہ عیسائی کمانڈر وسیلوس کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ ارطغرل کو مارنے میں ہر طرح کا تعاون کرے گا۔ اس کے برعکس اورال کا چھوٹا بھائی آلیار جذبہ ایمانی سے لبریز ایک ایسا سپاہی ہے جسے ارطغرل نے، جو اَب سردار اعلیٰ کا مقام پا چکا ہے، چاودار قبیلے کا سردار بنادیا ہے۔ ارطغرل آلیار کے ساتھ مل کر اورال اور وسیلوس کو شکست دیتا ہے لیکن اس جنگ میں آلیار شہید ہو جاتا ہے۔ اسی دوران ارطغرل کا دوسرا بیٹا ساوچی پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ پہلا بیٹا گوندوز ہے۔ ارطغرل کے قریبی ساتھی بامسی کی شادی مقتول عیسائی گورنر کی بیٹی حیلینہ سے ہو جاتی ہے۔ ارطغرل کی خواہش پر ترگت کی شادی چاودار قبیلے کے سردار کی بیٹی اصلاحان خاتون سے ہو جاتی ہے جس کے باعث قائیوں کو چاودار کی بھرپور معاونت حاصل ہے۔

سلطان علاؤالدین ارطغرل کی پے در پے فتح مندیوں پہ بہت خوش ہے اور اسے سردارِ اعلی کے ساتھ ساتھ اناطولیہ کی سرزمینوں کو ہمیشہ کے لیے ارطغرل کو دے دیتا ہے۔ امیر سعد الدین جو کہ سلطنت کا سب سے بڑا غدار ہے اور سلطان کو مار کر خود تخت پر بیٹھنے کا ارادہ رکھتا ہے، منگولوں کے ساتھ اسی غرض سے ہر طرح کے معاہدے کر کے سلطنت کو شدید نقصان پہنچاتا ہے۔ مگر وہ اس قدر شاطر دماغ کا شخص ہے کہ اپنے کیے کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا بلکہ اپنے ہر اقدام کا قصوروار ارطغرل کو ٹھہراتا ہے۔ تیسرے سیزن کے اختتام میں وہ کاراجا

حصار کے نئے کمانڈر کے ساتھ مل کر ارطغرل کے لیے ایک جال بچھاتا ہے اور سیزن کے اختتام پر یہی تاثر ہے کہ امیر سعد الدین اپنے ارادوں میں کامیاب ہو چکا ہے اور ارطغرل کو شہید کر دیا گیا ہے۔

چوتھے سیزن کے آغاز میں تاثر یہ ہے کہ ارطغرل مارا جا چکا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس ارطغرل غلام فروش تاجر کے نرغے میں پھنس چکا ہے۔ سعد الدین کو اب کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ قائی قبیلے کی سرداری ارطغرل کے چھوٹے بھائی دوندار کے پاس ہے۔ جو کم ہمت ہے اور امیر سعد الدین کی چالوں کو سمجھنے سے قاصر بھی۔ لہذا امیر سعد الدین اسے نہ صرف ہانلی بازار بیچنے پر قائل کر لیتا ہے بلکہ اس بات پر بھی آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس تجارت کے بعد یہاں سے واپس اپنے بھائیوں کی طرف ہجرت کر جائیں گے۔ تاہم ارطغرل غلام فروشوں سے چھٹکارا پا کر اپنے قبیلے لوٹ آتا ہے۔ اس حیران کن اور ناقابل یقین واپسی پر سب بہت خوش ہیں جبکہ اس کے دشمن، سعد الدین اور عیسائی کمانڈر ایریس ازحد حیران اور پریشان۔ ارطغرل پھر دشمنوں کی ہر چال کو ناکام بناتا ہے۔ ایریس جو کہ عیسائی کمانڈر ہے امیر سعد الدین کے ساتھ مل کر ارطغرل کو ہر طرح کے جال میں پھنسا کر مارنے میں ناکام ہے۔ اور آخر کار اس کے کردار کی عظمت سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو جاتا ہے۔ اسی دوران ارطغرل کا تیسرا بیٹا پیدا ہوتا ہے اور حلیمہ خاتون کی وفات ہو جاتی ہے۔ منگول فتنہ پھر سر نکالتا ہے اور ارطغرل نہ صرف منگولوں کو بلکہ اپنے سب سے بڑے دشمن امیر سعد الدین کو ان کے انجام تک پہنچاتا ہے۔

پانچویں سیزن میں ارطغرل کو ایک ایسے دشمن کا سامنا ہے جو کلیسا کی گھنٹی بجانے والے کے بھیس میں ہے۔ وہ ارطغرل کے آس پاس منڈلاتا رہتا ہے۔ مگر وہ اس سے بے خبر ہے۔ اس کا اصل نام ڈریگوس ہے جو بازنطینی فوج کا باغی کمانڈر ہے۔ مگر اپنا نام بدل کر زانگوچ رکھ لیتا ہے۔ اور ارطغرل کے سرائے میں صفائی اور گھوڑوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ کلیسا کی گھنٹیاں بھی بجاتا ہے۔ پانچواں سیزن جو کہ آخری ہے، اس میں ارطغرل کو ڈریگوس، اور الباسطی نامی دشمنوں کا سامنا ہے۔ یہ دونوں ہی بھیس بدل کر اس کے آس پاس ہیں۔ ان کا مقابلہ اس لیے بھی مشکل ہے کہ وہ نظر نہیں آرہے محض ان کے نام ہیں۔ وہ کارروائی کرتے ہیں اور اپنا نام لکھ جاتے ہیں۔ الباسطی ترک قبیلے کا ایک سردار ہے مگر منگولوں کے ہاتھوں بک چکا ہے اور اب منگولوں کے اشارے پر ترکوں کا خون بہا رہا ہے۔ یہ دونوں بظاہر ارطغرل کے خیر خواہ ہیں مگر اصل میں یہی دو اس کو بدترین نقصان پہنچا رہے ہیں۔ الباسطی کی دو بہنیں الیبگے خاتون اور سرما خاتون ہیں۔ سرما اپنے بھائی کی طرح مفاد پرست اور لالچی

عورت ہے جبکہ ایلیگے خاتون ایک صاحب ایمان اور انصاف پسند عورت ہے۔ ارطغرل کو اس کی یہ خصوصیت بھا جاتی ہے اور وہ اپنی والدہ کے اصرار پر اس سے شادی کے لیے رضامند نظر آتا ہے۔ ایلیگے بھی ارطغرل سے از حد متاثر ہے اور دونوں میں نسبت طے ہو جاتی ہے۔ ارطغرل اپنی ذہانت، اور خداداد صلاحیتوں کے پیش نظر الباسطی اور ڈریگوس کو شکست دیتا ہے اور ان کی گردنیں قلم کر دیتا ہے۔ اسی دوران برکے خان جو کہ چنگیز خان کی اولاد میں سے ہے، اسلام قبول کر لیتا ہے۔ ارطغرل اس کے ساتھ کامیاب مذاکرات کرتا ہے یوں دونوں میں اتحاد ہو جاتا ہے اور ایلیگے خاتون کے ساتھ شادی کے بعد ارطغرل اپنے قریبی ساتھیوں اور فوج کے ساتھ نئے محاذ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ یہیں ڈرامے کا یہ سیزن اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

## حوالہ جات


1۔ شیخ عبدالرشید، پروفیسر، علامہ اقبال کے تصوراتِ تاریخ (مضمون)/شریعہ اکادمی
http://olsharia.org/2006

2۔ ابن خلدون، عبدالرحمٰن، علامہ، تاریخ ابنِ خلدون، جلد اول، الفیصل، لاہور، 2008، ص 13

3۔ Finkel , caroline, Osman,s Dream: the Story of the ottoman empire,1300-1923

4۔ انصار عباسی، ارطغرل غازی سے اتنی چڑ کیوں! (کالم) روزنامہ جنگ، 10 مئی 2020
/https://ahleharam.com/ansar-abbasi-articles-artural-sey-chirr-q

5۔ آمنہ مفتی، اڑیں گے پرزے، آپ ارطغرل دیکھیے! (کالم) روزنامہ جنگ، 10 مئی 2020

6۔ https://www.youtube.com/watch?v=P5ieIbInFpg

7۔ امتیاز علی تاج، انارکلی، انجمن ترقی اردو، دہلی، 1941، ص 4

8۔ عبدالحلیم شرر، فردوسِ بریں، دیباچہ و ترتیب، سید وقار عظیم، پروفیسر الفیصل لاہور، 2007، ص 5

9۔ محمد بوزداغ، آزاد، دائرہ المعارف، ویکیپیڈیا۔
https://ur.m.wikipedia.org/wiki/%D9%85%D8%AD%D9%85%D8%AF_%D8%A8%D9%88%D8%B2%D8%AF%D8%A7%D8%BA

10۔ محمد بوزداغ، ڈائریکٹر ڈراما "ارتغرل غازی" سے ڈاکٹر فرقان حمید کا انٹرویو، ملت ٹائمز۔
https://www.muslimtoday.in/urdu/2021/06/11/exclusive-
/interview-with-muhammad-bozdagh-director-of-ertugrul-ghazi

11۔ یونس ایمرے (راہ عشق) سیزن، 1، قسط 1، پی ٹی وی ہوم،
https://www.youtube.com/watch?v=6ufrJgsIS70

12۔ ارطغرل غازی (اردو) سیزن 1، قسط 1، پی ٹی وی ہوم،
https://www.youtube.com/watch?v=fa89NxhAKis

باب دوم

# تاریخی تناظر میں ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کا مطالعہ

## الف: تاریخ بطور فکشن اور فکشن بطور تاریخ

### i۔ تاریخ: مفہوم اور بنیادی وظائف

ہسٹری یعنی تاریخ یونانی لفظ (Historia) ہسٹوریا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: تحقیق یا اطلاع۔ علم تاریخ ایک قدیم علم ہے جس کا تعلق ماضی کے ان حالات، واقعات، تحریکات، عوامل و عواقب، روایات، آثار اور علامات سے ہے جن کا سرچشمہ انسانی افکار و خیالات، جذبات اور ذہنی و مادی محرکات ہیں۔ تاریخ کی مدد سے ہم ان محرکات کا پتہ لگانے اور اسباب و نتائج کی روشنی میں ماضی کے واقعات و حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخ ایک علم ہے۔ واقعات کی تحقیق و تفتیش کا نام ہے۔ بنیادی طور پر یہ عربی کا لفظ ہے۔ انگریزی لفظ ہسٹری کا اصل ماخذ لاطینی زبان کا ایک لفظ "ہسٹوریا" ہے اور وہاں سے اس کو انگریزی میں لفظ ہسٹری میں تبدیل کر کے شامل کر لیا گیا۔ اس کے معنی بھی بالکل یہی ہیں یعنی ابتدائی تفتیش و تحقیق۔

مفکرین کی آرا کی روشنی میں تاریخ کے مفہوم کے مختلف زاویے سامنے آتے ہیں۔ کارلائل کا کہنا ہے کہ "تاریخ مختلف سوانح عمریوں کا نچوڑ ہے"۔ [1] برٹرینڈ رسل کا خیال ہے کہ "تاریخ زیادہ تر اس سوال کا جواب فراہم کرتی ہے کہ واقعات کس طرح رونما ہوئے"۔ [2] ان تعریفوں کے مطالعے سے تاریخ نویسی کی مختلف جہتوں اور رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ تاریخ ایک دلچسپ مضمون ہے اور اس کا مطالعہ انسان کو جرات مندی کا جذبہ عطا کرتا ہے۔

تاریخ نویسی کے طویل پس منظر کا جائزہ لیں تو ہمارے سامنے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ابتداً اہل یونان تاریخ کو تلاشِ حق کا ایک ذریعہ سمجھتے رہے ہیں۔ بعد ازاں جوں جوں انسانی علوم میں اضافہ ہوا اور وسعت پیدا ہوتی چلی گئی تاریخ نویسی کو سائنس کا درجہ عطا کیا گیا۔ تاریخ ادب کا ایک اہم شعبہ قرار دیا گیا۔ تاریخ افراد کی معاشرتی زندگی کے کارناموں اور سرگرمیوں کی داستان کا نام ہے۔

انیسویں صدی تک تاریخ ادب کا ہی حصہ بنی رہی۔ انیسویں صدی عقلیت (Rationalism) کا دور ہے۔ علوم وفنون میں بے حد ترقی ہوئی۔ مسلمہ عقائد نئی سائنسی ایجادات سے رد کیے گئے۔ اس کا اثر تاریخ پر بھی ہوا اور تاریخ نویسی کے قدیم نظریات میں بھی انقلاب پیدا ہوا اور اسے معاشرتی سائنس کا درجہ دیا گیا کہ تاریخ روایت درایت اور علت و معلول کے قاعدہ کے تحت واقعات و حالات کا تجزیہ کر کے ایسے جامع اصول مقرر کرتی ہے کہ جس کے تحت ہمیں ماضی کے واقعات و حادثات کی سائنسی و عقلی توجیہات کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ جب تک تاریخ میں یہ انقلابی نظریہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ تاریخ محض ماضی کے واقعات پر مشتمل قصہ کہانی ہی بنی رہی اس لیے ماضی میں لکھی گئی تاریخ میں کوئی ایسی روایات اور واقعات شامل ہو گئے جن کی سائنسی توجیہ کرنا آسان نہیں۔ لیکن دوسری طرف جدید دور کے احتیاط پسند مورخین نے روایات کی چھان پھٹک میں اس قدر احتیاط سے کام لیا ہے کہ تاریخ محض شخصیتوں اور سنین کا خشک مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تاریخ نویسی کا بیشتر کام سیاسی دباؤ اور سیاسی تناظر میں مکمل ہوا ہے۔ مثلاً خلفائے راشدین کے عہد کی تاریخ زیادہ تر بنی امیہ کے عہد ملوکیت میں لکھی گئی اس طرح دورِ امیہ کی تاریخ دور عباسیہ میں تحریر ہوئی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ کوئی مورخ کسی خاص عہد کے سیاسی تعصب کی بنا پر اسباب کا تجزیہ کرنے میں مکمل غیر جانب داری کا مظاہرہ نہ کر سکا ہو۔ لیکن سن و سال کا تبدیل کرنا یا واقعات و حوادث کے نتائج میں ترمیم کرنا پھر بھی ممکن نہیں تھا۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالنا مناسب ہے کہ تاریخ تحریر کرنے کے عمل میں فنی لحاظ سے تمام مورخ فنی نزاکتوں سے بہرہ ور ہوں یا وہ مکمل طور پر غیر جانب دار رہے ہوں، ممکن نہیں ہے۔

اپنے وسیع معنوں میں تاریخ کا اطلاق ان تمام حالات اور واقعات پر ہوتا ہے جو ماضی میں کبھی رونما ہو چکے ہیں۔ مگر ہم ماضی کی کسی شے کا نہ تو مشاہدہ کر سکتے ہیں اور نہ تجربہ۔ چونکہ مشاہدے کے لیے مشاہدہ کار کی موجودگی اور تجربے کے لیے "حال" ضروری ہے۔ لہٰذا ماضی کا بالواسطہ مطالعہ ان نشانات، آثار اور باقیات کی مدد سے ہو سکتا ہے جنہیں نسل انسانی نے بطور ورثہ چھوڑا ہے اور جن تک ہماری رسائی اب تک ممکن ہو سکی ہے۔

جس طرح بہت سے علوم و فنون کا آغاز سر زمین یونان سے ہوا اسی طرح تاریخ نویسی کی ابتدا بھی یونان سے ہوئی۔ پروفیسر عبد الرب اپنی کتاب "تاریخ کا مطالعہ کیسے کیا جائے" میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ لسانی اعتبار سے ہسٹری کا لفظ ایسے لفظ سے نسبت رکھتا ہے جس کے معنی بننے کے ہیں۔ جس طرح دھاگوں کی مدد

سے نمونہ یا ڈیزائن ترتیب دیا جاتا ہے اس طرح یونانیوں کے نزدیک تاریخ کا مقصد یہ تھا کہ ماضی کی تحقیق کے ذریعے اہم واقعات کو دھاگوں کی طرح استعمال کر کے ایک داستانی شکل تیار کی جائے۔ اس طریقے کے تحت ترتیب دی گئی داستانی شکل کو ادبیات کا حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ تقریباً500 قبل مسیح ہیروڈوٹس **(Herodotus)** نامی ایک یونانی نے چند ممالک کی سیر کر کے وہاں کے حالات کو داستانی شکل میں قلم بند کیا۔[3] ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق اس کی تحریروں کا اصل موضوع یونانیوں اور ایرانیوں کے درمیان تصادم تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تھائی سی ڈایڈس **(Thy Cididus)** نے نصیحت آمیز تاریخ نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اس نے تاریخی واقعات کو اس طرح ترتیب دیا کہ اس زمانے کے سیاسی حالات سے ان کا رشتہ قائم ہو سکے۔ تاریخ کے یہ دونوں پیش رو نہ صرف اپنے زمانے کے مقبول تاریخ نگار تھے بلکہ ان کے اتباع میں اس طرح کی تاریخیں لکھنے کا سلسلہ برابر قائم رہا۔

ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق انیسویں صدی سے پہلے تاریخ بالعموم رزمیہ نظموں اور داستانوں کی شکل میں لکھی جاتی تھی۔ اس میں اکثر قصہ کہانی اور تخیل کی رنگ آمیزی شامل ہوتی تھی۔ ایسا تاریخی لٹریچر یا فکشن ہر زبان و ادب میں ملتا ہے۔ ہومر کی ایلیڈ، فردوسی کا شاہنامہ، مہابھارت کی کتھائیں اور اردو میں عبدالحلیم شرر کے ناول اور امتیاز علی تاج کا ڈراما انارکلی تاریخی ادب کی مثالیں ہیں۔[4] یہاں نپولین کا قول "تاریخ کیا ہے؟ ایک فرضی کہانی جس پر ہم اتفاق کر لیں"[5] کی حقانیت بھی زیادہ واضح ہوتی ہے۔

علمِ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے دو تصور موجود ہیں۔

1۔ مجرد واقعات نگاری کہ مورخ گزرے واقعات کو من و عن بیان کرے اور قوموں اور بادشاہوں کی داستانیں غیر جانب داری سے بیان کرے۔

2۔ محض بیانِ واقعات نہیں بلکہ ان میں جو ربط و تعلیل کا قدرتی سلسلہ ہے اسے دریافت کرے اور قوموں کے عروج زوال کے اسباب کی نشان دہی کرے۔

تاریخ کے بارے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ یہ بادشاہوں، جنگوں، سازشوں، فتوحات کا احوال ہے جبکہ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس میں مجرد واقعات و شخصیات کا تذکرہ مقصود نہیں ہوتا۔ اگرچہ تاریخ سائنٹیفک اور معروضی اندازِ فکر کی متقاضی ہے۔ مگر سب حلقے اپنی اپنی تاریخ کو حقائق سے زیادہ جذبات اور خواہشات کے زیرِ اثر لکھتے اور پڑھتے ہیں۔

فکشن کی تاریخ میں بھی داخلیت ناگزیر ہے۔ لیکن یہاں داخلیت حقائق کی پیش کش میں بہت محتاط ہوتی ہے۔ حقائق کو مسخ کر کے اپنی ذاتی خواہش یا پسند کو ترجیح دینا تاریخی بد دیانتی تصور کی جاتی ہے۔ معروف انگریزی مورخ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے مطابق تاریخ انسان کو حقیقت سے دور کر دیتی ہے اور اس کی وجہ تعصب، وطن پرستی اور نسلی عداوتوں کے جذبات ہوتے ہیں۔ لہذا تاریخ کے توسط سے حقائق کی تلاش ایک ناممکن بات ہے۔ پروفیسر خلیل الرب اپنی کتاب "تاریخ کا مطالعہ کیسے کیا جائے" میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

> "تاریخ کے بارے میں یونانیوں کا یہ تصور کہ وہ تحقیق کا موضوع بھی ہے اور واقعات کی مدد سے تاریخی نمونہ بننے کا ذریعہ بھی، ہر مکتبہ فکر کے مورخین نے درست تسلیم کیا ہے۔ تاریخ میں ادب اور سائنس دونوں کے پہلو مضمر ہیں۔ سائنسی پہلو کا تقاضا یہ ہے کہ ماضی میں جو کچھ رونما ہو چکا ہے اسے دریافت کیا جائے اور یہ پتہ لگایا جائے ہ تاریخی مواد کی صحت کی تحقیق و تصدیق کے لیے شواہد کہاں سے اور کس طرح حاصل کیے جائیں اور آرٹ یہ ہے کہ تحقیق کے حاصلات کی خوب صورت پیرائے میں پیش کش کی جائے۔"[6]

### ii۔ فکشن: معنی، مفہوم اور بنیادی خصائص

عالمی ادبیات پر نظر ڈالیں تو فکشن کی موجودگی ازمنہ قدیم ہی سے نظر آتی ہے۔ بدلتے زمانوں کے ساتھ ساتھ فکشن میں کئی طرح کی تبدیلیاں ہوتی گئیں لیکن بنیادی چیز جو فکشن کو فکشن بناتی ہے وہ کہانی یا قصہ ہے، جو آج بھی فکشن کی عمارت کا سب سے مضبوط رکن ہے۔ یہ قصہ قاری کو اپنی گرفت میں لے کر اسے پڑھنے پر اکساتا ہے۔ قصے کہانی سننا ہر دور کے انسان کو مرغوب رہا ہے۔ انسان کہانیاں کہتا، سنتا اور اس سے سبق اخذ کرتا رہتا ہے۔ گویا ہر وہ صنف جس میں قصہ یا کہانی کو مرکزی حیثیت حاصل ہو فکشن کے زمرے میں آتی ہے، چاہے وہ داستان ہو، ناول ہو، ڈراما ہو یا افسانہ۔

فکشن کے لغوی معنی بناوٹ، ساخت، بندش اور اختراع کے ہیں۔ فکشن کا لفظ لاطینی لفظ Fictus یا Fictio سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کسی چیز کو بنانے، سنوارنے یا تبدیل (Modling) کرنے کا عمل۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا کے مطابق فکشن کی تعریف یہ ہے:

"Fiction; literature created from the imagination not

presented as fact, though it may be based on a true story or situation."[7]

گویا فکشن سے مراد ایسا کوئی بھی تخلیقی کام ہے جو کلی یا جزوی طور پر مصنف کا خود ساختہ ہو۔ فکشن کا عمل تخلیق کار کے ذہن اور تخیل کی اختراع ہے۔ کیمبرج ڈکشنری میں فکشن کے معنی یہ تحریر ہیں:

"The type of book or story that is written about imaginary characters and events and not based on real people and facts".[8]

پروفیسر انور جمال نے اپنی تصنیف ادبی اصطلاحات میں داستان اور فکشن کو ہم معنی لیا ہے۔ ان کے مطابق داستان ایسی طویل کہانی ہے جو حقیقی زندگی کی بجائے محیر العقول واقعات سے تعلق رکھتی ہے۔[9] پروفیسر آل احمد سرور لفظ فکشن کو اردو میں استعمال کرنے کی وجہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"فکشن کا لفظ ناول اور افسانہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں فکشن کے لیے افسانوی ادب کی اصطلاح بھی برتی گئی ہے۔ مگر چونکہ افسانہ ہمارے یہاں مختصر افسانے کے لیے مخصوص ہو گیا ہے اس لیے اگر افسانوی ادب کہا جائے تو پڑھنے والے کا دھیان مختصر افسانے کے سرمائے کی طرف جائے گا۔۔۔ اس لیے میرے نزدیک ناول اور افسانہ دونوں کے سرمائے کے لیے فکشن اور فکشن کا ادب استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"[10]

فکشن کی ابتدائی صنف داستان کو قرار دیا جاتا ہے۔ داستان کی کہانی طویل، محیر العقول واقعات اور کرداروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ واقعات مافوق الفطرت ہوتے ہیں۔ دل چسپی اور تجسس داستان کی جان ہے۔ داستان ہر زبان و ادب میں موجود ہے۔ علم و عرفان کی ترقی اور سائنسی ایجادات کے فروغ کے باعث انسان داستان کی تحیر انگیز دنیا سے باہر نکلا۔ ناول کو داستان کی ترقی یافتہ صورت کہا جا سکتا ہے۔ اس کے لغوی معنی نیا یا انوکھا کے ہیں۔ ناول انگریزی ادب سے اردو میں شامل ہوا۔ ابتدائی اردو ناول بھی رومانوی اور طلسماتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جن کی نوعیت تاریخی ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ حقیقت بیانی ناول کی خصوصیت قرار پائی۔ افسانہ

بیسویں صدی کی سب سے نمایاں صنف ہے۔ افسانے میں کوئی ایک قصہ کہانی، واقعہ کا مکمل بیان ہوتا ہے۔ جسے ایک ہی نشست یعنی آدھ گھنٹے سے ایک یا دو گھنٹے میں پڑھا جاسکتا ہے۔ وحدتِ تاثر افسانے کا جوہر ہے۔

فکشن کی صنف ڈراما یونانی لفظDrau سے نکلا ہے۔ جس کے معنی کچھ کر کے دکھانا یا حرکت یا عمل ہیں۔ یہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں ایک مکمل کہانی، کرداروں کے عمل اور حرکات سے سٹیج، ریڈیو یا ٹی وی پر مکالموں کے ذریعے پیش کی جاتی ہے۔

ڈرامے کی اہم ترین قسمیں المیہ اور طربیہ کہلاتی ہیں۔ المیہ ڈراما وہ ہے جس میں تصادم اور کشمکش کی بنیاد شان دار اور اعلیٰ انسانی عمل پر ہو مگر اس کا انجام اس کے اہم کرداروں کی شکست یا موت کی صورت میں ہو۔ طربیہ ڈراما میں زندگی کی ناہمواریوں اور کرداروں کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور اس کا انجام خوشگوار ہوتا ہے۔ اوپیرا منظوم ڈرامے کو کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ ایک ایکٹ کا ڈراما ہوتا ہے۔ اس میں کردار اور مناظر کی کمی ہوتی ہے۔

### فکشن کے عناصر:

فکشن کے عناصر ترکیبی کے حوالے سے اگرچہ مختلف آرا موجود ہیں تاہم اکثر و بیشتر ناقدینِ ادب متفق ہیں کہ فکشن کے بنیادی عناصر میں پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر نگاری، تکنیک، تھیم (اور ڈرامے کی صورت میں) موسیقی شامل ہیں۔

کسی بھی قصے کی عمارت پلاٹ پر کھڑی ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا نقشہ ہوتا ہے جس میں تخلیق کار کرداروں اور مکالموں اور منظر کے ذریعے رنگ بھرتا ہے۔ آغاز سے لے کر کہانی کے اختتام تک ایک مضبوط پلاٹ ہی فکشن کے کسی صنف کو مقبول یا مجہول بناتا ہے۔ ڈراما نگاری کی صورت میں یہ اور بھی مشکل اور نازک کام ہوتا ہے۔ ڈراما نگار کا فرض ہے کہ وہ پلاٹ کی مختلف کڑیوں کو اچھی طرح مضبوط کرے تاکہ کسی مقام پر بھی ڈرامے کی کہانی میں خلا کا احساس پیدا نہ ہو۔ کردار نگاری بھی فکشن کا اہم جزو ہے۔ اصناف اقسام کے مطابق کردار نگاری کو پیشِ نظر رکھنا مصنف کی اہم ذمہ داری ہے۔ کردار جس قدر بھرپور اور زندگی سے قریب ہوں گے اسی قدر کہانی کا تاثر گہرا کرنے کا باعث بنیں گے۔ مکالمے کی ذریعے ہی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ فکشن نگار کا فرض ہے کہ وہ موقع و محل کے مطابق ہر کردار کی گفتگو اس کے مقام و مرتبے کو ملحوظ رکھ کر کرے۔ ہر کردار کی گفتگو میں حقیقت کا

گمان اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ فطری انداز میں بات کرے۔ بالخصوص ڈرامے کے کرداروں کے مکالمے مختصر اور روزمرہ زندگی کے مطابق ہونے چاہیں۔ منظر نگاری بھی فکشن کا ایک اہم عنصر ہے۔ بعض مناظر واقعات کو موثر بنانے اور کرداروں کو واضح کرنے میں اہم پس منظر فراہم کرتے ہیں۔ فکشن نگار کے پیشِ نظر کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے جسے وہ ناول یا ڈرامے میں کرداروں کی گفتگو کے ذریعے اپنے قارئین اور ناظرین تک پہنچاتا ہے۔ لہذا ایسی صورت میں کہانی کے ذریعے کہانی کار کے فلسفہ حیات سے بھی آگہی ہوتی ہے۔ مگر فکشن نگار کو براہِ راست خطاب کرنے یا وعظ دینے سے گریز کرنا چاہیے۔

ڈرامے میں موسیقی ایک اہم جزو ہے۔ بسا اوقات موسیقی کی کوئی دھن مکالموں سے زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ بالخصوص ریڈیو اور ٹی وی کے ڈرامے تو موسیقی کے بغیر ممکن ہی نہیں کیوں کہ پس منظر کی موسیقی ڈرامے کے تاثر کو گہرا کرتی ہے۔

تاریخی فکشن کی صورت میں مصنف کو بہت بڑا چیلنج یہ درپیش ہوتا ہے کہ اسے ماضی کو حال کے آئینے میں منعکس کرنا ہوتا ہے۔ ریڈر ڈائجسٹ 2013 کے شمارے کے ایک سروے کے مطابق 75 فیصد قارئین تاریخی فکشن صرف اس لیے پڑھتے ہیں کہ وہ ماضی کی زندگی کو حال میں دیکھنا چاہتے ہیں۔[11] تاریخی فکشن کے دوران مصنف کی سب سے بڑی کامیابی یہی مانی جاتی ہے کہ وہ پہلے چند پیراگراف یا مناظر میں قاری کو ماضی کی طرف بہا کر لے جائے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم بھی فکشن کے حوالے سے قصہ یا کہانی کو بنیادی چیز سمجھتے ہیں ان کے مطابق:

> "ایسی ہر تحریر جس میں کسی واقعہ، کہانی یا افسانے کو بیان کیا جائے فکشن کے زمرے میں آئے گی۔ اسی لیے اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اس میں حکایت بھی شامل ہے اور تمثیل بھی۔ داستان، ناول یا افسانہ (طویل یا مختصر) بھی، ناولٹ بھی اور ڈرامے بھی۔ یہاں تک کہ منظوم ڈرامے بھی اور ایسی مثنویاں بھی جن میں قصہ پن کا عنصر ملتا ہے"۔[12]

### iii۔ تاریخ اور فکشن: ارتباط اور تفاوت

تاریخ حقائق کی دستاویز ہے اور مورخ کو حقائق کی دریافت و تحقیق کی طرف راغب کرتی ہے۔ جبکہ فکشن حقائق کو بھی تخیلات کے پر لگا کر اڑانے کا عمل ہے۔ فکشن نگار کا منصب (چاہے وہ تاریخی فکشن ہی کیوں نہ لکھ رہا

ہو) حقائق کی دریافت و تحقیق کی پابندی نہیں۔ البتہ کامیاب تاریخی فکشن وہی ہو گا جو حقیقت اور تصور کا بہترین امتزاج ہو۔

تاریخی فکشن نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے موضوع کی جزئیات پر مکمل گرفت ہو۔ قصہ جس عہد سے متعلق ہے اس عہد کی تمام سیاسی، سماجی اور اعتقادی زندگی سے اسے مکمل آگہی ہو۔ کوئی بھی ادب پارہ جو تاریخ کے موضوع پر ہو اسے تاریخ سمجھ کر نہیں پڑھا جاسکتا۔ اسے فکشن کے طور پر ہی دیکھنا چاہیے کیونکہ تاریخ تخیل اور رنگ آمیزی سے مبرا ہے اور فکشن کے لیے یہی دو چیزیں رنگینی کا باعث بنتی ہیں۔ لہٰذا تاریخی فکشن کو تاریخ کا قائم مقام نہیں کہا جاسکتا۔ اگرچہ تاریخی فکشن میں کردار، واقعات، عہد، معاشرتی کوائف تاریخی اعتبار سے کتنے ہی مستند ہوں۔ ڈاکٹر علی عباس حسینی کے مطابق:

"ناول کی جگہ وہاں ہوتی ہے جہاں تاریخ کے صفحے سادے اور خاموش ہوں۔ امتدادِ زمانہ کی وجہ سے جو واقعات صاف نہیں دکھائی دیتے یا جو شخصیتیں دھندلی پڑ گئیں ہیں انہیں قصے یا افسانے میں واضح کر کے دکھا سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تاریخ کا آفتاب عالم تاب خود ہی نصف النہار پر چمک رہا ہو وہاں ناول کی شمع جلانا حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔"[13]

ڈاکٹر علی احمد فاطمی تاریخی فکشن کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخی ناول وہی سب سے اچھا اور کامیاب سمجھا جائے گا جو خوبصورتی کے ساتھ تاریخی ماحول کو پیش کرے۔ وہ جس دور کی منظر کشی کرے آنکھوں میں اتر جائے اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ پورے تاریخی واقعات کو پوری سچائی سے پیش کرے، پھر وہ تاریخی ہو جائے گا۔۔۔ جہاں تاریخ کے اوراق دھندلے پڑ جاتے ہیں ناول نگار اپنے تخیل کی روشنی سے اسے روشن اور تابناک کر دیتا ہے۔"[14]

عام قاری کی تاریخ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی، اس کی ایک بڑی وجہ مورخین کا اندازِ تحریر ہے جو عام طور پر خشک اور بے رنگ ہوتا ہے۔ محمد احسن فاروقی اس نکتے کی تصریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اسلامی مورخ ابتداً تاریخ لکھتے وقت عبارت کی دل آویزی اور بیان کی دلکشی کا خیال نہیں رکھتے تھے لیکن اس سے تاریخ ایک خشک مضمون بن جاتا تھا۔ جس کی بنا پر عام قاری کی دلچسپی قائم نہیں رہتی تھی جبکہ یورپ میں فن تاریخ نویسی ترقی کر گیا تھا اور وہاں تاریخ

نویسی کے ساتھ ادبی چاشنی کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔"[15]

تاریخ حقائق اور نظریات پر مبنی دستاویز ہے۔ اس کے برعکس تاریخی فکشن ان دونوں سے بالا بھی ہے اور آزاد بھی۔ تاریخی فکشن نگار تاریخی حقائق کا اسیر محض نہیں۔ فکشن نگار اپنے تخیل اور خلاقی کو کام میں لاتے ہوئے آزادی کے ساتھ تاریخی حالات وواقعات اور عوامل کو بھی اپنی مرضی اور قصے کی فنی وفکری ضروریات کے تحت تبدیل کر سکتا ہے اور یوں قاری کے لیے مزید دلچسپی کا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ جبکہ مورخ کے حقائق میں تخیل کی آمیزش اصل میں ملاوٹ کے مترادف ٹھہرتی ہے۔ مورخ منظر کشی کیے بغیر تاریخ کے کسی واقعے کا ذکر کرتا ہے۔ جبکہ فکشن نگار کسی بھی دور کی معاشرتی زندگی اور طرز حیات کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں کھینچتا ہے کہ قاری اس دور کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا محسوس کرتا ہے۔ بالخصوص جغرافیائی ماحول کی منظر کشی سے تاریخی دور کے وہ مرقعے جو وقت کی گرد کی نذر ہو گئے، قاری کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ فکشن نگار تاریخی ادوار پر پڑی صدیوں کی دھول کو اپنے قلم کی نوک سے اس طرح کھرچتا ہے کہ قاری کو ماضی کے یہ اوراق صاف دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخی فکشن نگار عموماً ایسے دور اور کرداروں کا انتخاب کرتا ہے جس میں عوام کی دلچسپی یقینی ہوتی ہے۔ صدیوں پرانی تہذیب کو اس طرح پردہ شہود پر لانا کہ قارئین اور ناظرین خود کو اس دور میں چلتا پھرتا دیکھیں فکشن نگار کا مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ کام مشکل اور نازک بھی ہے۔ بسا اوقات فکشن نگار کو متنازعہ امور کا سامنا بھی ہوتا ہے جس میں از حد احتیاط ہی مصنف کو محفوظ رکھتی ہے۔

مورخ صرف مواد کی چھان پھٹک کرتا ہے۔ وہ مواد جمع کرتا ہے، اس کو پرکھتا ہے۔ فکشن نگار اس مواد کو ایک کہانی، قصے، ڈرامے میں منتقل کر کے ایک نئی دنیا بساتا ہے۔ اور نئی دنیائیں دیکھنا کون پسند نہیں کرتا!

مورخ اور فکشن نگار دونوں ماضی کے متلاشی ہیں۔ دونوں کا سفر ماضی سے متعلق ہوتا ہے۔ مگر دونوں کا اسلوب اور اندازِ فکر جدا جدا ہے۔ اول الذکر ماضی کی سچائیوں کو علت ومعلول کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور ثانی الذکر ان واقعات کو سچائیوں کو کہانی کی صورت دے دیتا ہے۔

## ب۔ اردو میں تاریخی فکشن اور تاریخی اردو ڈرامے کی روایت کا اجمالی جائزہ

تاریخی فکشن کا کمال یہ ہے کہ کسی بھی گزشتہ دور کی تصویر اس حسن وخوبی سے کھینچی جائے کہ وہ دور

ہماری آنکھوں کے سامنے جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا نظر آئے۔ اسی خوبی کی بنا پر تاریخی فکشن کو ہر زبان میں پذیرائی اور مقبولیت ملتی رہی ہے۔ جہاں تک اردو میں تاریخی فکشن (افسانہ ناول) کا تعلق ہے تو یہ صنف انگریزی ادب سے ہی اردو میں آئی۔ ڈاکٹر محمد شاکر نے اپنی کتاب "اردو میں تاریخی ناول نگاری" میں یہی مقدمہ قائم کیا ہے کہ اردو میں عبدالحلیم شرر کو پہلا ناول نگار مانا جاتا ہے اور ان کا ناول ملک العزیز ورجنا" پہلا اردو ناول ہے۔ جو کہ انہوں نے سر والٹر سکاٹ کے تاریخی ناول "طلسمان" سے متاثر ہو کر لکھا۔[16] سر والٹر سکاٹ نے اپنے ناول طلسمان نے عرب کی اسلامی زندگی کے بارے میں کچھ سطحی قسم کے نقوش ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو اردو تاریخی فکشن میں عموماً مذہبی موضوعات شامل تھے۔ تاریخی فکشن مذہبی جوش و خرودش اور حمیت اسلامی کی بیداری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ خود عبدالحلیم نے اپنے ناول ملک العزیز ورجنا کے متعلق بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ سید وقار نے اپنی کتاب "داستان سے افسانے تک" میں ان کے اس قول کا حوالہ دیا ہے جسمیں انہوں نے ملک العزیز ورجنا کے متعلق بتایا کہ یہ ناول مسلمان دوستوں میں بے حد سراہا گیا۔ اس ناول نے قوم اسلام کے وہ کارنامے دکھائے جو بجھے ہوئے جوشوں اور پژمردہ حوصلوں کو از سر نو زندہ کر سکتے ہی۔ اس کا ہر جملہ رگ حمیت اسلامی کو جوش میں لاتا ہے۔ ان کے اس ناول کا موضوع صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ اول کے صلیبی معرکے ہیں۔[17]

مندرجہ خیالات کی روشنی میں ہمیں عبدالحلیم شرر کی تاریخی ناول نگاری کا مقصد بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم میں مذہبی جوش و جذبہ اور قومی حمیت کی از سر نو بیداری چاہتے تھے۔ سو اس کے لیے تاریخ گزشتہ رفعتوں اور عظمتوں کے لیے اہم آلہ کار ثابت ہوئی۔ وہ اپنے مضمون "ناول" میں لکھتے ہیں: "ناول نے اکثر مختلف اقوام و ممالک کی تاریخ کو ایسے دلچسپ عنوان سے شائع کیا کہ معمولی قابلیت کے لوگ حتیٰ کہ عورتیں تک تاریخ کو ایک نہایت دلچسپ فن خیال کرنے لگیں۔"[18]

تاریخ گزرے ہوئے زمانے کی کہانی ہے۔ جسے بیان کرنے یا لکھنے کے عمل میں عصر حاضر کے اضطراب کا ہاتھ ہوتا ہے۔ انسان نامساعد حالات اور سنگین طرز حیات سے بیزار ہو کر خوشحال اور پر سکون زندگی گزارنا چاہتا ہے اور یہی فطری اور رومانوی خواہش اسے تاریخ کو زندہ کرنے اور اس میں اپنی خواہش کے رنگ بھرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

عبدالحلیم شرر کی تقلید میں ان کے ہم عصر فکشن نگاروں میں بھی تاریخی ناول کی طرف توجہ مبذول کی۔ جن میں نمایاں نام حکیم محمد علی خان طیب کا ہے۔ ان کے تاریخی ناول میں "نیل کا سانپ" اور "عبرت" کو بہت مقبولیت ملی۔ نیل کا سانپ" اگرچہ طبع زاد نہیں ہے کیونکہ اس کی تخلیق میں انہوں نے شیکسپیئر کے دو ڈراموں "جولیس سیزر" اور انتو فلو بطیرہ" سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے ناول میں تقریباً وہی واقعات بیان ہوئے ہیں جو شیکسپیئر کے مندرجہ بالا ڈراموں ہے۔ اور ان کی ترتیب و تنظیم بھی وہی ہے۔ البتہ "عبرت" کو ناقدین نے ان کا شاہکار ناول قرار دیا ہے۔ یہ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کا قصہ پانچویں صدی عیسوی کے اٹلی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی کہانی بانی فس جو کہ مغربی روم کا گورنر ہے کے بیٹے اور مغربی روم کی حکمراں بلیڈیا کی بیٹی کی داستانِ عشق پر مشتمل ہے۔ سوائے ناموں کے اس ناول میں اور کچھ تاریخی نہیں۔ سارے واقعات تخیلی اور رومانوی ہیں۔ معاشرت بھی اٹلی کی بجائے لکھنو کی زیادہ نمائندگی کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمد شاکر کے مطابق حکیم محمد علی خان طبیب نہ صرف تاریخی شعور سے نابلد تھے بلکہ فن ناول نگاری سے بھی واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ جب کہ شرر مورخ بھی تھے اور ناول کے فن سے آگاہ بھی تھے۔

حکیم محمد سراج الحق نے بھی تاریخی ناول لکھے۔ ان کے ناولوں میں "فیروز شاہ" اور "ماہ وخت" قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر ناول کا قصہ فیروز شاہ بہمی کے عہد سے ہے۔ آخر الذکر ناول میں حضرت عمر رض کے زمانے کے تاریخی واقعات، فتوحات شام وایران کے حالات اور مسلمانوں کی بہادری کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔

شرر کے معاصرین میں موہن لال نہم بھی ہیں جنہوں نے شرر کی تقلید میں بے شمار ناول لکھے جن میں "شیر دکن" حرم خانہ سلطانی اور نگزیب" اور پری خانہ " قابل ذکر ہیں۔ ان کے ہاں شرر کی بجائے بنکم چندر رچڑ جی کے اثرات زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔

شرر کی تقلید میں نہ صرف ان کے معاصر ناول نگاروں نے یہی ناول لکھے۔ ایسے فکشن نگاروں کا ایک ایسا قافلہ نظر آتا ہے جنہوں نے تاریخ کو فکشن کی صورت میں (جس میں ناول خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے) بہت عام کیا۔ ایسے ہی تاریخی فکشن نگاروں میں راشد الخیری بھی ہیں۔ ان کے تاریخی ناول "ماہِ عجم" "یاسمیں شام" "زہرہ مغرب" "آفتاب دمشق" اور "سمرتا کا چاند" لکھے۔ مگر تاریخی ناول نگاری راشد الخیری کے بس کا روگ نہ تھا۔ بطور "مصورِ غم" انہوں نے خواتین کے مسائل اور دکھوں کو زیادہ عمدگی سے اجاگر کیا۔

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ترجمے کے روپ میں تاریخی ناولوں کا سراغ ملتا ہے۔ مصر کے مصنف جرجی زیدان کے تاریخی ناول کے ترجمے بہت مقبول ہوئے۔ جن میں "ابن طولون" "حجاج بن یوسف" "امیر المومنین عبدالرحمن الناصر" "امین و مامون" "محبوبہ مصر" "عروس فرغانہ" اور "ابو مسلم خراسانی" قابلِ ذکر ہیں۔

مصری ناولوں کے علاوہ انگریزی متشرق مارماڈیوک پکتھال کے تاریخی نوعیت کے ناولوں کے ترجمے اردو میں کیے گئے۔ جن میں **Early House** کا ترجمہ "الامان" کے نام سے قاضی اشتیاق حسین نے کیا تھا۔

اسی دور میں دتاریہ کیفی نے 1931ء میں نہتا رانا یارواداری" نامی تاریخی ناول لکھا جس کا مقصد اور موضوع ہندو مسلم اتحاد تھا۔ اس ناول کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ مگر ناقدین اس کو بہ طور ناول اہمیت نہیں دیتے۔

تقسیم برصغیر سے پہلے مولانا صادق حسین سردھنوی نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے اردو میں تاریخی فکشن میں اضافہ کیا اور اس صنف میں اپنا نام پیدا کیا۔ انہوں نے اپنے ناول "طارق" کے دیباچہ میں تاریخی ناول لکھنے کا سبب بھی اسلاف کے حیرت انگیز کارناموں کی یاددہانی ہے۔ ان کے مطابق یہ ناول دراصل سرفروشان اسلام کے کارناموں اور کارہائے نمایاں اسلام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جس کی بدولت مسلمان پکے مسلمان بن سکتے ہیں۔ اور اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے تقریباً ایک سو ناول لکھے ہیں۔ اگرچہ یہ ناول جمالیاتی اقدار سے محروم رہے۔ البتہ ان کے ناولوں میں دلچسپی تجسس کا عنصر جلوہ فرما رہتا ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں عصر حاضر کے مسلمانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے لگتے ہیں۔ اگرچہ ناولوں میں تاریخی واقعات صداقت پر مبنی ہوتے ہیں مگر کردار نگاری اور مکالمہ نگاری میں خاصی کمزوری ہے۔ مولانا صادق حسین کے ناولوں میں "آفتاب عالم" ان کا شاہکار ہے۔ اس کا موضوع سرور کائنات کی حیات معرکہ ہے۔ مولانا نے اردو میں تاریخی ناول نگاری کی روایت کو برقرار رکھا۔

تاریخی فکشن آزادی کے بعد:

1947ء کا سال برصغیر کی عوامی زندگی کے لیے ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ ملک کی تقسیم کی خون ریز داستان "آزادی کی مسرت انگیز نعمت اور لاکھوں انسانوں کی غم انگیز ہجرت اور تقسیم کی ہولناکیوں پر کئی ناول، افسانے لکھے گئے۔ جن میں ایم اسلم کا "رقص ابلیس" رشید اختر ندوی کا "پندرہ اگست" قدرت اللہ شہاب کا "یا خدا" نسیم

حجازی "خاک اور خون" اور رئیس احمد جعفری کا "مجاہد" اہم ناولوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ سارے ناول تاریخی نوعیت کے ہیں۔ کیوں کہ یہ ناول ہندوستان کی تاریخ کے ایک بحرانی دور کی خونیں داستان بیان کرتے ہیں۔
اگر ہم اس دور کی فکشن کا جائزہ لیں تو یہ احساس بہت نمایاں ہوتا ہے کہ اس دور میں فکشن نگار طبقہ شاید کچھ عرصہ کے لیے یہ بھول گیا کہ تاریخی موضوع کے علاوہ بھی کچھ لکھا جاسکتا ہے۔

جہد آزادی اور حصول آزادی مسمانان برصغیر کی تاریخ کے نہایت اہم باب ہیں۔ اس بے بعد ایک نیادور تھا اور نئے تقاضے سو اس دور کے فکشن نگاروں کے سامنے اس قوم کی ایک شان دار اور ولولہ انگیز داستان ہے جو اس وقت آزمائش کے ایک بڑے سخت دور سے گزر رہی ہے۔ نسیم حجازی، ایم اسلم، رئیس احمد جعفری نے اسی نصب العین کے لیے تاریخی ناول لکھے اور پھر خوئی قسمت کہ اس دور میں ان حضرات کے ضخیم ناولوں کا مطالعہ عوام کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ اور یوں ان تاریخی ناولوں کو صحیفوں کا درجہ ملنے لگا۔
نسیم حجازی کا صرف ایک ناول "سفید جزیرہ" کے سوا تمام تاریخی ناول "آخری چٹان" "یوسف بن تاشفین" "آخری معرکہ" "خاک و خون" "مسافر" بہت مقبول ہوئے۔ سید وقار عظیم کے الفاظ میں ان کی شہرت کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں کے لیے تاریخ اسلام کے صرف ایسے واقعات منتخب کیے ہیں جو کسی نہ کسی طرح سبق آموز ہونے کے علاوہ ایسے امکانات کے حامل ہیں جن سے قصے میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ ناولوں کی ترتیب اور پیش کش کی اہمیت سے بھی وہ خوب واقف ہیں اور اس پر مکالمے اور عبارت آرائی ان کے ناولوں میں حسن وخوبی پیدا کرتی ہے۔[19]

**iv۔ تاریخ بطور فکشن اور فکشن بطور تاریخ**

فکشن اور تاریخ ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ فکشن حیاتِ انسانی کے تجربے اور تخیل کی داستان ہے اور تاریخ زمین پر انسانی زندگی کی ترتیب شدہ سلسلے وار کہانی۔ اگرچہ فکشن اور تاریخ اپنی اصل تکنیک اور طریقہ کار کے اعتبار سے دو الگ الگ شعبہ حیات ہیں۔ مگر اس کے باوجود دونوں میں ارتباط و موافقت بھی موجود ہے۔ بعض مفکرین فکشن کو تاریخ پر برتری دیتے ہیں اور بعض کے نزدیک تاریخ سے بڑی صداقت اور کوئی نہیں۔ جبکہ حقیقت دونوں کے بین بین ہے۔ بسا اوقات فکشن نگار مورخ سے بہتر طور پر واقعات کو بیان کرتا ہے

اور تخیل کی مدد سے اس خلا کو پر کر دیتا ہے۔ جہاں تاریخ خاموش ہے۔ اور بسا اوقات مورخ ایسے حقائق دریافت کرتا ہے جس کے باعث فکشن کے واقعات پر انگلی اٹھائی جا سکتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں بھی چلتے ہیں اور ایک دوسرے کو راستہ بھی دکھاتے ہیں۔

فکشن نگار تاریخی واقعات کا پابند نہیں لہذا اگر وہ تخیل سے کام لیتے ہوئے تاریخی حقائق کے بر خلاف جاتا ہے تو اس بنا پر اس پر گرفت نہیں کی جا سکتی۔ یہ قاری یا ناظر کی ذمہ داری ہے کہ وہ فکشن کو فکشن اور تاریخ کو تاریخ کی سطح پر رکھ کر فیصلہ کرے۔ ہم نے دیکھا کہ ابتدا میں تاریخ پر داستانوی اثرات بہت زیادہ تھے اس کے کچھ کردار اصلی تو کچھ افسانوی تھے۔ مافوق الفطرت طاقتوں کا بیان جن میں دیوی دیوتا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں تاریخ کا حصہ تھے۔ اگرچہ جدید زمانے میں تاریخ ایک سائنٹفک شعبہ علم ہے۔ تاہم آج تک اس کی اسناد پر سوال اٹھتے رہتے ہیں۔

ایسا فکشن جو تاریخی واقعات سے ماخوذ یا تاریخی ادوار سے متعلق ہو تاریخی فکشن کہلاتا ہے۔ اس فکشن میں تاریخ کے کسی واقعے، کردار یا مقام کو لے کر پلاٹ اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ ان سب میں بہت سے اضافے اور ترمیم کر دی جاتی ہے۔ یوں فکشن کے ذریعے ماضی کو ایک نئی زندگی، نئی تفہیم اور نئی تعبیر ملتی ہے۔ فی زمانہ اس صنف کا استعمال ناول اور افسانے سے لے کر فلم، ڈرامے اور ویڈیو گیمز میں بے تحاشا ہو رہا ہے۔

تاریخی فکشن کا جائزہ لیا جائے تو اردو میں اس کی بہت نمایاں مثال سید امتیاز علی تاج کا ڈراما "انار کلی" ہے۔ یہ ڈراما شہزادہ جہانگیر اور اس کے محل کی ایک کنیز کی داستان محبت پر مشتمل ہے۔ اسے ہم نیم تاریخی المیہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ انار کلی نامی کسی کنیز کا ذکر تاریخ میں نہیں۔ خود امتیاز علی تاج نے بھی اس کردار کے بارے میں وضاحت کی کہ یہ تاریخی کردار نہیں بلکہ تخلیقی ہے۔ سب سے پہلے اسے ایک انگریز ولیم فنچ نے تخلیق کیا۔ جسے عبد الحلیم شرر نے داستان کی شکل دی اور بعد ازاں امتیاز علی تاج کے قلم نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ یہ ڈراما بارہا سٹیج کیا گیا۔ بالی وُڈ نے اسے کئی بار سلور سکرین پر اتارا۔ "مغلِ اعظم" اسی موضوع پر برصغیر کی مقبول ترین فلموں میں سے ایک تھی۔ یہ تاریخی فکشن کا کمال اور مقبولیت ہے کہ انار کلی نامی ایک افسانوی کردار شہنشاہ اکبر اور بادشاہ جہانگیر کا حوالہ بن گیا۔[20]

نسیم حجازی کا مشہور ناول "شاہین" اسلامی تاریخی ناول کی مثال کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ناول پہلی

مرتبہ 1948ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں 1492ء میں غرناطہ کے سقوط کی صورت حال اور وجوہات بیان کی گئی ہیں اور ساتھ ہی غرناطہ میں مسلمانوں کے جاہ جلال اور اقتدار کی تباہی اس ناول کا موضوع ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن نے اس کی ڈرامائی تشکیل کی اور بعد ازاں اسے فلم کے بڑے پردے پر "غرناطہ" کے نام سے پیش کیا گیا۔[21] اس ناول کا مرکزی کردار اندلس کا ایک حریت پسند نوجوان بدر بن مغیرہ ہے۔ جسے ناول نگار نے شاہین کا نام دیا ہے۔ جو اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ اسلام دشمن قوتوں سے نبرد آزما ہے اور مسلمانوں کی ریاست کو بچانے کے لیے ہمہ وقت حریفوں سے پنجہ فگن ہے۔ بدر بن مغیرہ اور اس کے ساتھی غرناطہ کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں وہ اور اس کے ساتھی ایک پہاڑی جنگل میں رہتے ہیں جہاں بیٹھ کر وہ دشمن پر حملے کے منصوبے بناتے ہیں۔ اس کی بہادری، بے خوفی، مسلمانوں سے ہمدردی اور کامیاب منصوبہ بندی کے باعث وہ عوام اور امرا میں "عقاب" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کردار کی تخلیق بھی سرتاپا نسیم حجازی کے ذہن کی اختراع ہے۔ غرناطہ اور سپین کی تاریخ میں بدرین مغیرہ نامی کردار کا کوئی وجود سرے سے موجود نہیں۔

انارکلی کی طرح "جودھابائی" کو بھی ایک تاریخی شخصیت کی حیثیت حاصل ہے۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ شہنشاہ اکبر کی 34 بیویاں تھیں مگر ان میں سے کسی کا نام بھی جودھابائی نہ تھا۔ یہ ایک انگریز کرنل جیمس ٹوڈ Col. James ToD کی کتاب "Annals and Antiqiuities of Rajastham" کی اختراع ہے۔[22] کچھ مورخوں کے مطابق جودھا اکبر کی بیوی تھی اور کچھ کے مطابق جہانگیر کی۔ بعض کے نزدیک جودھا کبھی موجود ہی نہیں تھی۔ اس کے نہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اکبر کی تین تاریخوں ابوالفضل کی اکبر نامہ، بدایوانی کی منتخب التواریخ اور نظام الدین احمد کی طبقات اکبری میں کہیں بھی جودھا کا ذکر نہیں۔ اکبر جو کہ تزک لکھنے میں بہت باقاعدگی اختیار کرتا تھا، اس میں بھی جودھا کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ جہانگیر کی والدہ راجپوت راج کماری ضرور تھی مگر اس کا اصل نام ہیرا الکنوائی تھا جو راجا بہاری مل کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی اور شہنشاہ اکبر سے شادی کے بعد اس کا نام مریم زمانی رکھا گیا تھا۔ مگر بالی وُڈ کی فلم "جلال الدین" جسے بعد میں اکبر کا خطاب ملا کی مقبولیت کے بعد کس کو اس بات کا یقین آتا ہے کہ جودھا نامی کوئی کردار تاریخ میں موجود نہیں تھا؟[23]

ایک انگریز مصنف ولیم کروک William Crooke نے اس بات کی اصلاح کی کہ جیمس ٹوڈ نے غلطی سے جودھا کو اکبر کی بیوی بتایا۔ اصل میں اکبر کی بیوی امر کے حکمران راجا بہاری مل کی بیٹی تھی۔ جودھا بائی کا

مطلب ہے جودھا کی خاتون۔

یوں دیکھا جاسکتا ہے کہ تاریخی فکشن کے ذریعے قوموں میں کس کس طرح کے نظریات پلانٹ کیے جار ہے ہیں اور تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش بھی کی جارہی ہے۔

مغرب میں اس کی مثالوں میں موجودہ صدی کے اوائل میں بننے والی فلم "Gladiator" ہے جسے بے حد پسند کیا گیا۔ مقبولیت کے ریکارڈ توڑتی اس فلم کو متعدد آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مگر کم لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ یہ فلم تاریخ نہیں بلکہ تاریخی افسانے پر مبنی ہے۔ اس فلم کی کہانی " میکسمیس (جو کہ اس فلم کا ہیرو ہے) کے گرد گھومتی ہے۔ سلطنت روما کا بادشاہ مارکس اوریلیس اپنے فوجی جرنیل میکسمیس پر بے حد اعتبار کرتا ہے۔ مگر بادشاہ کا بیٹا ایک جاہ طلب شہزادہ ہے۔ جسے اپنے باپ اور میکسمیس کی دوستی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ میکسمس کا حاسد ہے اور جب اسے پتا چلتا ہے کہ بادشاہ میکسمیس کو اپنا نائب بنانے والا ہے تو وہ اپنے باپ کو قتل کر دیتا ہے اور میکسمیس کو ساتھ نہ دینے کی صورت میں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا ہے۔ بعد ازاں پوری کہانی گرفتار ہو کر غلام بنائے جانے والے میکسمیس کے گرد گھومتی ہے۔ وہ Gladiators یعنی غلام پہلوانوں میں بہت مقبول ہو جاتا ہے۔ آخر میں وہ اپنے مقتول بادشاہ اور اپنے اہلِ خانہ کے قتل کا بدلہ لے کر ملک میں دوبارہ سے آئین و قانون بحال کراتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ اس فلم کا زیادہ تر حصہ تاریخی فکشن پر مبنی ہے۔ یہ تاریخی حقیقت نہیں بلکہ تاریخی افسانے پر مبنی ایک کہانی ہے۔ یہ درست ہے کہ روم کے بادشاہ مارکوس اوریلئس کے بیٹے کموڈوس کے خلاف اسی کے دور حکومت میں خطرناک سازشیں ہوئیں اور سب ناکام بھی ہو گئیں مگر اس فلم کا ہیرو ایک ہسپانوی جرنیل ہے جو کہ سراسر فرضی کردار تھا۔ روم کی تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

اگرچہ تاریخی فکشن میں مصنف کے پاس آزادی ہوتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے تاریخ میں اضافے یا ترامیم کر سکتا ہے۔ نئے کردار تخلیق کر سکتا ہے۔ واقعات کو پلاٹ کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مصنف تاریخی ڈراما یا ناول لکھنے کا دعوی کرتا ہے تو پھر اسے تاریخی بد دیانتی کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے، ورنہ پذیرائی کی جگہ سخت تنقید بھی مصنف کے حصے میں آسکتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخی بد دیانتی کا ایسا استعمال اکثر حریف قوموں کے لیے ہوتا ہے۔ بالخصوص مذہبی بنیادوں پر اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ (بھارتی فلموں میں جس طرح مسلمانوں کے کردار دکھائے جاتے ہیں یا مغرب کا میڈیا عربوں کو جس طرح

پیش کرتا ہے) مغربی اور بھارتی فلموں میں مسلمانوں اور عربوں کا کردار اس طرح بنایا جاتا ہے کہ جیسے یہ سب وحشی اور ظالم ہوں۔ کئی کئی شادیاں کرنے کے عادی ہوں۔ اگرچہ یہ فلمیں ہی ہوتی ہیں مگر عام شخص ان سے بہت اثر قبول کرتا ہے اور اسے پورا سچ مان کر مسلمانوں کے لیے ایک منفی تصور رکھتا ہے۔

CBS نیوز کے ایک مڈل ایسٹرن کنسلٹنٹ جیک جی شہیان Shaheen نے– Reel Bad Arabs How Holly Wood Vilifies a people کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔[24] 2006 میں میڈیا ایجوکیشن فاونڈیشن نے اسے ایک دستاویزی فلم کے طور پر پیش کیا۔ اس کتاب میں شہیان نے ایسی فلموں کی نشان دہی کی ہے جس میں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عربوں اور مسلمانوں کو انتہائی سفاک اور ظالم دکھایا گیا ہے۔ جیک شاہین نے یہ تجزیہ پیش کیا ہے کہ ہالی ووڈ کس طرح پوری دنیا میں عربوں کے بارے میں منفی بیانیہ تشکیل دیتا ہے۔ اس دستاویزی فلم میں جیک نے ایک ہزار فلموں کو لیا جس میں عربوں اور مسلمانوں کے کردار ہیں۔ ان فلموں کا دورانیہ 1896–2000 ہے۔ جیک نے تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات واضح کی ہے کہ کس طرح امریکی فلموں میں عربوں کو ڈاکو، وحشی اور خانہ بدوش قبیلوں کی صورت دکھایا گیا ہے یا پھر ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھما کر انہیں دہشت گرد ثابت کیا گیا ہے۔ عربی خواتین کا کردار بھی منفی صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ وہ زیادہ تر ایسی لالچی عورتیں ہیں جو دولت مند عربوں کے لیے رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ فلم پہلی بار جون 2007ء کو واشنگٹن میں پیش کی گئی۔ "لارنس آف عریبیا" نام کی فلم بھی اس تناظر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے آغاز میں دکھایا گیا ہے کہ ایک عرب دوسرے عرب کو محض اپنے کنویں سے پانی پینے کی پاداش میں قتل کر دیتا ہے۔ اس تناظر میں بہت سی فلموں کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

خالد حسینی جو کہ افغان امریکن مصنف ہیں نے اپنا پہلا ناول "The Kite Runner" کے نام سے 2003 میں شائع کروایا۔ یہ ایک افغان بچے کی کہانی ہے جو کابل کا رہنے والا ہے۔ عامر نامی یہ بچہ 1989 افغانستان پر روسی حملے کے بعد امریکا منتقل ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ ایک سادہ سی کہانی ہے مگر غیر محسوس طریقے سے اس میں افغان طالبان کی تصویر کشی کی گئی ہے اور یہ تصویر کشی منفی پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ یہاں طالبان کو ایک طرف انتہائی سفاک، مذہبی شدت پسند دکھایا گیا ہے جو اسلامی سزا دینے میں کسی رحم کو خاطر میں نہیں لاتے اور دوسری طرف ان کی ہم جنس پرستی اور بچوں کے ساتھ زیادتی کو بڑی بے باکی سے دکھایا گیا ہے۔ سوچا جائے تو طالبان کے

یہ کردار اپنے اندر متضاد خصوصیات رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے متصادم نظر آتے ہیں۔ مگر عام لوگ ایسی ناقدانہ نظر سے فلموں کو نہیں دیکھتے اور نہ ہی ناول کو۔ یوں ایک پوری قوم کو بدنام کر کے ان کے حقوق کا بھی استحصال کیا جاتا ہے۔

اسی طرح فلم "American Sniper" کی مثال ہے جس کے ذریعے دشمن قوموں کے خلاف نفرت اور متعصبانہ رویوں کو فروغ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ فلم 2014ء میں ریلیز کی گئی۔ اس فلم کو دیکھنے کے بعد عراقیوں کے خلاف نسل پرستانہ اور جارحیت پسند ٹویٹس کی بھرمار ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فلم میں عراقی مردوں کے ساتھ ساتھ بچوں اور عورتوں تک کو دہشت گرد دکھایا گیا تھا اور فلم میں ایسا تاثر ابھارا گیا تھا کہ گویا عراقی ہی 9/11 کا باعث بنے ہوں۔ اس کے برعکس حقیقت کیا تھی؟ سب پر عیاں تھا کہ نیٹو کی بمباری کی زد میں آنے والے مظلوم عراقی ہی تھے مگر خبروں کی نسبت فکشن زیادہ طاقت ور دکھائی دیتا ہے۔ اس فلم کو بھی آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مندرجہ بالا فلمیں جو کہ ناول سے ماخوذ تھیں تاریخی فکشن کی ذیل میں ہی شمار ہوتی ہیں۔ کیونکہ روس اور امریکہ کا افغانستان پر حملہ اور عراق پر امریکی حملہ تاریخی حقائق ہیں۔ مگر ان حقائق کو عین درست اقدام ثابت بھی تو کرنا تھا!

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ فکشن کو تاریخ پر برتری حاصل ہے۔ اس میں واقعات اور ادوار کے پہلو بہ پہلو انسانی نفسیات کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس تاریخ میں صرف واقعات کا بیان ہوتا ہے۔ فکشن میں واقعات کو فنکارانہ چابک دستی سے پیش کیا جائے تو اس کے حسن اور تاثر میں اضافے کے ساتھ ساتھ تاریخی صحت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ بالخصوص ناول میں تاریخی شعور بہت بالغ اور تاریخی ادوار کے مطابق ہوتا ہے۔ بعض لوگ فکشن بالخصوص ناول کو تاریخ سے بڑا قرار دیتے ہیں اور بعض ناقدین تاریخ کو فکشن کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ مشہور ناول نگار ہنری جیمز کے مطابق وہی ناول حقیقتاً ناول ہے جو تاریخ کے زیر اثر ترتیب دیا گیا ہو۔ اردو کے مشہور ناول نگار مرزا ہادی رسوا کے نزدیک ناول تاریخ سے زیادہ اہم ہے۔

تاریخ نویسی کے آغاز کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا کہ تاریخ داستانوں کے زیر اثر رہی۔ اس کے واقعات اور کردار حقیقت اور افسانے کے بین بین تھے۔ لہٰذا اس دور میں تاریخ اور فکشن میں فرق از حد مشکل کام تھا۔ مگر

جہاں وقت کے ساتھ ساتھ ہر شعبہ علم ترقی کرتے ہوئے سائنسی طریقہ کار اپنانے لگا وہیں تاریخ میں بھی سائنسی اور معروضی انداز اختیار کیا گیا اور تاریخی واقعات اور کرداروں پر تحقیق و تصدیق لازمی ہوتے گئے۔ اگرچہ آج بھی تاریخ کے بارے میں سو فیصد سچائی کا اطلاق تو نہیں ہو سکتا کہ یہ بہت سے تاریخی واقعات پرواز تخیل کا ثمر ہیں تاہم ایسے میں ہم انہیں تاریخی فکشن کے تحت پرکھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ تاریخ میں فکشن کے عناصر موجود رہتے ہیں تو فکشن میں تاریخ۔ جس طرح ایک اچھا فکشن نگار اپنے فکشن کو حقیقت سے قریب تر دکھانے کے لیے تاریخی واقعات کو اس سے منسوب کرتا ہے اسی طرح کبھی کبھار مورخ بھی فکشن کا سہارا لے کر تاریخ کو قارئین کی دلچسپی کی شے بنا دیتا ہے۔ مگر یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ فکشن اور تاریخ کے مقاصد میں فرق ہوتا ہے۔ فکشن کا بنیادی مقصد مسرت کا حصول ہے۔ فکشن نگار تاریخ کا سہارا قارئین کی دلچسپی اور تجسس کے لیے لیتا ہے۔ لہٰذا فکشن میں تاریخی واقعات کا بیان ذیلی حیثیت کا حامل ہو گا۔ لیکن تاریخ میں فکشن کا سہارا لینا خطرے سے خالی نہیں کیوں کہ تاریخ کا مقصد گزرے ہوئے زمانے کی حقیقت کو جوں کا توں بیان کرنا ہوتا ہے۔

فکشن بعض پہلوؤں میں تاریخ کی برابری کرتا ہے اور بعض حوالوں سے تاریخ سے بڑھ کر ہو جاتا ہے۔ مشہور قول ہے کہ تاریخ میں سند کے علاوہ سب کچھ غلط ہوتا ہے اور قصے میں سند کے علاوہ سب کچھ صحیح ہوتا ہے۔ فکشن میں انسانی معاشرے کے نشیب و فراز اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیاں مختلف زاویوں سے پیش کی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر احمد خان اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> "فکشن ادب کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں پورا معاشرہ اپنی تمام نیرنگیوں کے ساتھ منعکس ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں فکشن، زندگی کی حرارت اور اس کے نشیب و فراز کو محسوس کرنے کا ایک ایسا آلہ ہے جہاں تمام افراد اپنے مختلف رنگ وروپ اور خدوخال میں نمایاں نظر آتے ہیں"۔[25]

تاریخی فکشن بالخصوص تاریخی ناول دونوں میں افسانوی عناصر کی موجودگی رہتی ہے۔ کبھی تاریخ اسناد کی فراہمی میں ناکامی کی صورت میں افسانوں پر بھروسہ کرتی ہے تو کبھی فکشن مضبوط تاریخی شعور کے باعث تاریخ سے بہتر مقام پا لیتا ہے۔ غرض اس بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فکشن اور تاریخ کے درمیان ارتباط بھی ہے اور تفاوت بھی۔ نہ تو فکشن کو خالص تاریخ سمجھ کر پڑھا جا سکتا ہے اور نہ ہی تاریخ کو فکشن میں گڈمڈ ہونا چاہیے۔

## ب: تاریخی اردو ڈرامے کی روایت کا اجمالی جائزہ

اردو میں تاریخی فکشن کا جائزہ لینے کے دوران ہم نے دیکھا کہ نہ صرف برصغیر میں بلکہ ہر ملک کے ڈرامے میں ہیرو کی پیشکش ایک بنیادی کردار کے طور پر ہی رہی ہے۔ تاریخی ڈرامے تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت اسی شخص کو دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ ہیرو کوئی بڑا آدمی ہوتا ہے۔ جو بادشاہ، شہزادہ، جنگجو، سورما یا پھر کسی بڑے خاندان کا چشم و چراغ ہوتا ہے۔ یہ روایت صرف ان ملکوں میں ہی نظر نہیں آتی جہاں ملوکیت کا دور دورہ تھا بلکہ تاریخ کے اوراق اور قدیم روایت کی تقلید نے اس تصور اور اس سے پیدا شدہ اثرات کو مدتوں زندہ رکھا ہے۔ جن ملکوں میں شاہیت کا زمانہ گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا وہاں اور بھی نمایاں طور پر ان اثرات کا عکس ڈراموں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ چنانچہ آج بھی اس کی نمائش اور مقبولیت میں کمی واقع نہیں ہوئی اور یہ اسی آفاقی تاثر کی حامل نظر آتی ہے۔ اردو میں ہمیں اس نوع کی مثالیں عہد جدید کے بہت سے ڈراموں میں نظر آتی ہیں۔ اردو ڈرامے میں شاہانہ کرداروں کی روایت یہاں طویل عرصے تک ملوکیت کے اقتدار کے باعث منظوم و منثور داستانوی ادب کے اثرات کا نتیجہ ہے اور 1857 میں شہنشاہیت کے زوال کے بعد تک برسوں زندہ رہی۔ اردو سٹیج ہمیشہ شاہانہ کرداروں کے تزک و احتشام اور جاہ جلال سے جگمگاتا اور ان کے غیض و غضب سے گونجتا رہا۔ آغا حشر کی ڈراما نگاری کے آغاز تک اردو ڈرامے میں یہ انداز عام تھا۔ جب آغا حشر نے منشی احسن لکھنوئی کے ڈرامے "چندراوالی" کے تتبع میں 1857 میں اپنا سب سے پہلا ڈراما "آفتاب محبت" تصنیف کیا تو شاہانہ کرداروں کی پیش کش کی روایت مقبول عام تھی۔ چنانچہ اس کا پہلا منظر ہمایوں شاہ کے دربار سے شروع ہوتا ہے۔ رقص و نغمہ کی محفل برپا ہے اور اس کے بعد مکالموں کا آغاز ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ڈراما آغا حشر کی ابتدائی مشق کا نمونہ ہے۔ خود آغا حشر بھی اسے اپنی تصنیفات میں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ تاہم یہ ڈراما اردو تاریخی ڈرامے کی روایت کا ایک نمونہ ہے جسے اس عہد کی ڈراما نگاری کا آئینہ سمجھا جا سکتا ہے۔

آغا حشر کے اس ڈرامے اور بعد کی ڈرامائی تصنیفات میں شاہانہ ہیرو کی پیش کش کی روایت مستقبل طور پر تاریخی ڈراموں میں کار فرما نظر آتی ہے۔ "آفتاب محبت"، "اسیر ہوس"، "سفید خون"، "ترکی حور" اور "رستم و سہراب" ان سب ڈراموں میں ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں شاہ اور شاہ زادے جلوہ فرما ہیں، کہیں ریاست اور حکومت کے قائدین موجود ہیں تو کہیں اعلیٰ خاندانوں کے افراد کو پیش کیا گیا ہے جن کے افعال عام دلچسپی کے موجب ہو

سکتے ہیں۔ آغا حشر کے تاریخی ڈراموں کے علاوہ معاشرتی ڈراموں میں بھی نواب اور رئیس دکھائی دیتے ہیں۔

اسی روایت کی جھلک ہمیں سید امتیاز علی تاج کے المیہ "انارکلی" میں شہنشاہ اکبر اور شہزادہ سلیم کے کرداروں میں نظر آتی ہے۔ تاریخی ڈراموں میں مرکزی کرداروں کو شاہانہ کرداروں کے روپ میں پیش کرنے کی یہ روایت آگے چل کر ہمیں عہدِ جدید کے ڈراموں میں بھی نظر آتی ہے۔ احمد شاہ پطرس بخاری کا ڈراما "مصر کی رقاصہ"، عشرت رحمانی کا ڈراما "شاہ جہاں" اور "شہنشاہ جہانگیر" اور میرزا ادیب کے ڈرامے "مادرِ قوم" اور "نند کمار" وغیرہ کے کردار شاہانہ اور اعلیٰ مرتبہ شخصیات کے ہیں۔ اس طرح پی ٹی وی پر پیش کیے گیے تاریخی ڈرامے میں صفدر میر کے ڈرامے "بہادر شاہ ظفر"، "نواب سراج الدولہ"، "جلال الدین خلجی"، "قطب الدین مابرک خلجی"، "محمد بن تغلق شاہ" اور "سلطان محمد فیروز تغلق" سب میں ہیرو اور مرکزی کردار شاہانہ ہیں۔ میدان سیاست کے عمائدین، جنگی میدان کے سپہ سالار، ریاست کے حکمران وغیرہ ان ڈراموں میں مرکزی کرداروں کی صورت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح نسیم حجازی کے ناول پر مبنی ڈرامے 'شاہین" اور "چٹان" کے نہ صرف دوسرے کردار بلکہ مرکزی کردار بھی شاہانہ ہیں۔

مندرجہ بالا موضوع کے تحت تاریخی ڈراموں کے مطالعہ سے ڈرامے کے فن کا ایک اصول واضح ہوتا ہے کہ تاریخی ڈراموں میں قصے کا ہیرو بادشاہ یا کوئی بلند مرتبہ شخص بنتا ہے۔ جس کا انجام یا جدوجہد ایک پورے ملک یا پوری قوم کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ڈرامے کے مرکزی کردار کے حوالے سے یہ تنقیدی نقطہ نظر زیرِ تحقیق ڈرامے کے ہیرو "ارطغرل" کے مطالعے میں بھی مؤثر ہے۔

## ج۔ ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کا تاریخی تناظر

زیرِ تحقیق ڈراما دسمبر 2014ء میں ترکی کے سرکاری ٹیلی ویژن چینل ٹی آر ٹی (TRT) پر نشر کیا گیا۔ یہ ڈراما تیرہویں صدی کے مسلم دور کی عکاسی کرتا ہے کہ کس طرح ایک معمولی قبیلے سے اٹھنے والی قیادت نے دنیا کی عظیم الشان سلطنتِ عثمانیہ کی بنیادیں استوار کیں۔ اس ڈرامے کا نام "دریلیس ارطغرل" ہے جسے اردو میں ارطغرل غازی کا نام دیا گیا ہے۔ مذکورہ ڈراما پانچ سیزن پر مبنی ہے اور ایک سو پچاس اقساط ہیں۔ ہر قسط کا دورانیہ تقریباً دو گھنٹے کا ہے۔ TRT پر اب تک ایک سو ساٹھ ممالک میں اسے دیکھا جا چکا ہے۔ نوے سے زیادہ زبانوں نے

اسے ڈب کر کے پیش کیا ہے۔ اس کے مصنف اور ڈائریکٹر محمد بوزداغ ہیں اور ڈرامے میں ہیرو کے طور پر ترکی کے مشہور اداکار انگین آلتان دوزیان ہیں جنہوں نے "ارطغرل" کا کردار ادا کیا ہے۔ اس کے والد سلیمان شاہ ہیں جو کہ قائی قبیلے کے سردار ہیں۔

ارطغرل غازی کی بیوی اور ڈرامے کی ہیروئن حلیمہ سلطان ہے جو سلطان علاؤالدین کیکو باد کی بھتیجی ہے۔ شیخ ابن العربی نہایت اہم کردار ہے۔ ان کا تعلق اندلس سے ہے۔ وہ روحانی اعتبار سے ایک مضبوط شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کے ایک عظیم سکالر بھی مانے جاتے ہیں۔ ڈرامے میں ارطغرل غازی اور اس کے ساتھیوں کی قدم قدم مدد اور روحانی پیشوائی کرتے ہیں۔

ارطغرل (Ertugrul) ترکی زبان کا لفظ ہے اور دو لفظوں یعنی "ار" اور "طغرل" کا مرکب ہے۔ ترکی میں "ار" کے معنی آدمی، سپاہی یا بہادر آدمی کے ہیں جبکہ "طغرل" کے معنی پرندہ یا عقاب کے ہیں۔ ترکی میں یہ لفظ بطور اسم کے بھی رائج ہے اور صفت کے طور پر بھی۔ یوں ارطغرل کے معنی ہوئے بہادر شخص، عقابی صفات سے متصف انسان، عقابی شخص، عقابی سپاہی یا شکاری ہیرو۔

ڈرامے کے آغاز میں اس کا تعارف اس طرح کروایا جاتا ہے کہ یہ ڈراما سیریل تیرہویں صدی کے اناطولیہ (ترکی) کی تاریخ سے ماخوذ ایک عظیم الشان داستان ہے۔ ارطغرل ایک بہادر جنگجو ہے جو ایمان، انصاف اور محبت کے اوصاف سے لیس ہے۔ اپنی ثابت قدمی اور جرات سے نہ صرف اپنے قبیلے بلکہ عالم اسلام کی تقدیر بدل ڈالتا ہے اور غوز ترکوں کے خانہ بدوش کائی قبیلے کو ایک خطہ ارضی درکار تھا جہاں ان کی نسلیں پروان چڑھ سکیں۔ قائی قبیلہ کا سردار سلمان شاہ ہے جو اسلام سے والہانہ عقیدت رکھتا ہے، اس کا سب سے چھوٹا بیٹا ارطغرل ہے۔ ارطغرل نہایت بہادری، بے باکی اور سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے مختلف ادوار میں صلیبیوں، منگولوں اور سلجوق سلطنت میں موجود غداروں سے ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ 1280ء میں اس کی وفات کے بعد ارطغرل کے بیٹے عثمان نے سلطنت عثمانیہ کی بنیادیں رکھیں اور اس کے بعد خانہ بدوشوں کے اس قائی قبیلے نے تین براعظموں پر چھ سو سال تک حکومت کی۔ اس ڈرامے کو تاریخی کرداروں اور واقعات سے اخذ کیا گیا ہے۔

تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ارطغرل کا تعلق اوغوز یا غز ترک قبائل کی شاخ قائی قبیلے سے تھا۔ اس کے والد سلیمان شاہ تھے۔ ولادت کا زمانہ سنہ 1191ء کے قریب ہے۔ جبکہ وفات کے بارے میں حتمی طور پر

تو نہیں البتہ 1281ء قرین قیاس ہے۔ اس کا مزار ترکی کے شہر اناطولیہ میں ہے۔ ارطغرل ساری زندگی سلجوق سلطنت اور سلطان علاالدین کیقباد اول کا وفادار رہا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ زیر تحقیق ڈرامے میں "ارطغرل" کا کردار نہ صرف ہیرو کے طور پر آیا ہے بلکہ ایک ایسے ہیرو کے طور پر جو اپنے قبیلے ہی نہیں، سلجوقی سلطنت، بازنطینی سلطنت، صلیبیوں اور منگولوں کے لیے بھی سب سے بڑا چیلنج اور خطرہ بنا ہوا ہے۔ ان کا کردار پورے ڈرامے پر حاوی ہے۔ ڈرامے کی فضابندی اور پیشکش ایسی ہے کہ اس زمانے میں جبکہ ذرائع خبر ور سل بہت محدود اور سست تھے، کے باوجود ارطغرل کا نام اور کارنامے ایک دنیا جانتی ہے۔ دوستوں میں وہ بے حد مقبول اور دشمنوں کے لیے انتہائی مشکل ہدف کے طور پر سامنے آتا ہے۔

باوجود اس کے کہ اس ڈرامے کے بہت سے اہم کردار بالخصوص ارطغرل کے ساتھی خانہ بدوش ہیں، بہت ہی مہذب، ترقی یافتہ اور مدبر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس تاریخ کے صفحوں پر ارطغرل اور اس کے عہد سے متعلق معلومات انتہائی محدود ہیں اور جو میسر ہیں ان کی بنیاد بھی عثمانی روایات پر استوار ہیں جس پر بہت سے مؤرخین نے سوالات اٹھائے ہیں۔ ان عثمانی روایات کو دیکھا جائے تو ان کے مطابق ارطغرل عظیم سلطنت عثمانیہ کے معمار اول عثمان کے والد تھے اور بس اس بات کے علاوہ ان پر جو کچھ بھی مواد میسر ہے اس کی صداقت پر ہنوز تحقیق کی ضرورت ہے۔

تقریباً چھ سو سال تک دنیا کے ایک بڑے حصے یعنی تین براعظموں پر اپنی عمل داری قائم کرنے والے اس خاندان اور سلطنت کے ابتدائی خدوخال اور مصدقہ معلومات پر ڈھیروں گرد پڑ چکی ہے۔ سلطنت عثمانیہ سے متعلق زبان اردو میں بہت کم تحریریں موجود ہیں۔ انگریزی کتب اور مستشرقین نے جو کام اس حوالے سے کیا ہے وہ بھی تعصب سے خالی نہیں۔ اور قدیم ترکوں سے متعلق معلوماتی مواد کا ایک اہم وسیلہ اوغوز نامہ (Oghaz Nama) اور گور اوغلی کی داستانیں (Epic of Gorogly) ہیں جو کہ سینہ در سینہ لوک داستانوں کی شکل میں ترکوں کے ہاں چلی آرہی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ داستانوں کے ابتدائی نقوش اور پلاٹ میں بھی اضافہ ہونا ایک عام سی بات ہے۔ یوں بھی ہم نے تاریخ اور افسانے کے حوالے سے یہ بھی دیکھا ہے کہ جہاں تاریخی حقائق نہ ہونے کے مترادف ہوں وہاں فکشن اپنا کام دکھاتا ہے۔ ویسے بھی لوگ داستانوں کی موجودگی بجائے خود

اس بات کا اعتراف ہے کہ قوم کی جڑیں قدیم اور کسی بڑی تہذیب میں پیوست ہیں۔ ایک بات جس پر کسی مورخ کو اعتراض نہیں وہ یہ ہے کہ ارطغرل کے بیٹے عثمان کا تعلق آج کے ترکی میں اناطولیہ کے علاقے میں آباد ترک خانہ بدوش قبیلے سے تھا۔ اس کی حکومت بھی موجود تھی۔ اگرچہ یہ اس زمانے کی دوسری چھوٹی چھوٹی قبائلی حکومتوں کی طرح ایک چھوٹی سی حکومت تھی جن کی طاقت میں بھی کچھ زیادت تفاوت نہ تھی۔

سوال یہ ہے کہ آخر ارطغرل یا ان کے بیٹے عثمان نے ایسے کیا کمالات دکھائے جس کی بدولت وہ اپنے زمانے کی معمولی سی حکومتوں میں سے ایک حکومت ہوتے ہوئے ایک ریاست میں تبدیل ہوئے اور پھر یہ ریاست ایک ایسی سلطنت کی شکل اختیار کر گئی جس کی وسعتیں اور حکمرانی تین براعظموں تک پھیل گئی۔

سلطنت عثمانیہ کا آغاز 14ویں صدی کے اوائل میں ہوا اور اختتام بیسویں صدی میں، اس دوران ایک ہی خاندان کے 37 بادشاہ سلطنت کے تخت نشیں ہوئے۔ ظاہر ہے یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔

کیرولائن فنکل ایک برطانوی مورخ اور مصنف ہیں۔ انہوں نے سکول آف اوری اینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز یونیورسٹی آف لندن سے تاریخِ عثمانیہ پر اپنی ڈاکٹریٹ مکمل کی۔ وہ اپنی کتاب عثمان کا خواب: سلطنت عثمانیہ کی کہانی، میں رقمطراز ہیں کہ عثمانیوں کی کامیابی کی وجوہات کچھ بھی ہوں لیکن ان کی اناطولیہ (وہ علاقہ جو کسی حد تک آج کے ترکی کی حدود سے مطابقت رکھتا ہے) میں اپنے ہمسائیوں کے ساتھ دو صدیوں پر پھیلی ہوئی لڑائی انتہائی سخت تھی۔[26]

ڈراما سیریل میں ہم دیکھتے ہیں کہ ارطغرل کا قبیلہ سوغوت (Sogut) میں آباد ہے۔ یہ زرخیز علاقہ دریائے سقاریہ کے بائیں جانب بازنطینی سرحد کے قریب واقع ہے جہاں ایک طرف بازنطینی اور دوسری جانب منگول حملہ آوروں کے ساتھ آئے روز ان کی جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ علاقہ اسے سلطان علاؤالدین نے اسے اس کی شجاعت اور فتوحات سے خوش ہو کر عطا کیا ہے۔ چوں کہ ارطغرل کی جاگیر (سوغوت کی زرخیز زمینیں اور شہر) بازنطینی سرحد سے متصل واقع ہے اس لیے بازنطینی قلعہ داروں سے اکثر جنگ ہوتی رہتی ہے۔ دولت سلجوقیہ اندرونی اختلاف اور امرا (بالخصوص امیر سعد الدین کوپیک) کی غداریوں کے سبب زوال کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ ایک طرف منگولوں نے جنوبی اور مشرقی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا تو دوسری طرف عیسائیوں نے شمال اور مشرق کے قدیم بازنطینی صوبوں کے اکثر حصے واپس لے لیے ہیں۔ یوں سرحدی علاقوں میں جنگ کا سلسلہ اکثر

جاری رہتا ہے اور منگولوں کے حملے کا خوف کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اور اس سارے منظر نامے میں جو شخص غیر متزلزل عزم اور مستقل طور پر بر سرِ پیکار ہے وہ ہے ارطغرل غازی!

مشہور امریکی مورخ سٹیفورڈ جے شا (Stanford Jay Shaw) جو کہ سلطنت عثمانیہ کے مشہور محققین میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنی کتاب سلطنت عثمانیہ کی تاریخ اور جدید ترکی (History of the Ottoman Empire and Modern Turkey) میں لکھتے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ کی شروعات تاریخ کے طالب علموں کے لیے ہمیشہ سے اہم سوال رہا ہے لیکن اس دور کے ذرائع کی کمی اور پھر اس کے بعد کے دور میں لکھی گئی روایات میں تضاد کی وجہ سے پورے یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔[27] وہ بھی اس روایت کو بیان کرتے ہیں جس کے مطابق ارطغرل کے والد سلیمان شاہ تھے جو قائی قبیلے کے سردار تھے اور 12ویں صدی کے آخر میں شمالی ایران کے ایک علاقے میں آباد رہے۔ منگول حملہ آور ہر وقت ان قبائل پر حملہ کرتے اور لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھتے۔ اس خطرے سے بچنے کی خاطر یہ ترک قبائل نئے نئے علاقوں کی طرف ہجرت کرتے رہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زیر تحقیق ڈرامے کا آغاز قائی قبیلے کی ہجرت کے منظر سے ہوتا ہے اور اس ہجرت کا محرک بھی امن کی تلاش ہے۔ ڈرامے کے تعارف میں بھی یہ بات ہر قسط میں دہرائی جاتی ہے کہ قائی قبیلے کو ایک ایسے وطن کی ضرورت تھی جہاں ان کی نسلیں پروان چڑھ سکیں۔ جے شا کے مطابق ترکی قبائل تاتاریوں کے حملے کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر مارے مارے پھر رہے تھے۔ ان میں قائی قبیلہ بھی تھا جس کے سردار سلیمان شاہ تھے جو ارطغرل کے والد تھے۔ یہ قبیلہ اغزیا اوغوز قبیلے کا ایک حصہ تھا۔ یہ لوگ سلیمان شاہ کی سرکردگی میں اپنے وطن خراسان کو چھوڑ کر مختلف ملکوں میں گھومتے ہوئے شام کی طرف جارہے تھے کہ دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے سلیمان شاہ ڈوب کر جاں بحق ہو گئے۔[28]

کتاب "ترکی سلطنت" کے مصنف لارڈ ایورسلے کے مطابق یہ جماعت چار سو گھرانوں پر مشتمل تھی۔[29] سلطان علاؤالدین کے زیر سایہ پناہ لینے کے لیے یہ جماعت پایہ تخت کی جانب بڑھ رہی تھی کہ راستے میں انگورا کے قریب دو فوجیں برسرِ پیکار تھیں۔ ارطغرل نے اپنے جنگجوؤں کے ساتھ کمزور جماعت کا ساتھ دینے کا ارادہ کیا اور میدانِ جنگ میں اترا۔ یہ ترک اس بہادری سے لڑے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کمزور جماعت غالب آگئی اور طاقت ور جماعت نے راہِ فرار اختیار کی۔ معلوم ہوا کہ جس فریق کی ارطغرل نے مدد کی تھی وہ سلطان علاؤالدین سلجوقی کی

فوج تھی جسے تاتاریوں کی ایک بڑی فوج نے گھیر رکھا تھا۔ ارطغرل کے اس کارنامے کی وجہ سے سلطان علاؤ الدین نے اسے سوغوت (Sogutt) کا علاقہ جو دریائے سقاریہ کے قریب ہونے کے باعث نہایت زرخیز تھا، عطا کیا۔ اگرچہ ساتھ ہی یہ علاقے کے بائیں جانب بازنطینی سرحد بھی واقع تھی۔

کیرولائن فنکل بھی اپنی کتاب میں اس وقوع کا ذکر کرتی ہیں کہ عثمانی روایات کے مطابق ارطغرل نامی ایک قبائلی سردار شمال مغربی اناطولیہ میں آکر سلجوق اور بازنطینی سلطنتوں کے درمیان آکر آباد ہو گیا اور اسی روایت کے مطابق سلطان علاؤ الدین نے ارطغرل کو سوغوت نامی ایک جاگیر جس میں زرخیز زمین اور شہر شامل تھا ارطغرل کو عطا کر دی۔

مندرجہ بالا واقعات کا تاریخی تناظر میں جائزہ لینے کے بعد جب ہم ڈراما سیریل ارطغرل کو ملاحظہ کرتے ہیں تو یہ دونوں واقعات ہمیں ڈرامے میں دکھائی دیتے ہیں مگر دونوں واقعات کا وقت اور موقع مختلف ہے۔ اول الذکر واقعہ نے سلیمان شاہ والد ارطغرل غازی کی موت اگرچہ دریائے فرات میں ڈوب جانے کے باعث ہوتی ہے اور اس وقت جب یہ قائی قبیلہ ان کی سربراہی میں تارتاریوں کے حملے سے بچنے کے لیے اپنے وطن خراسان کو چھوڑ کر شام کی طرف کسی بہتر پناہ گاہ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے دو بیٹے واپس خراسان جاتے ہیں جبکہ ارطغرل جو کہ سب سے چھوٹا بیٹا ہے واپس جانے سے انکار کر دیتا ہے اور شام کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

ڈرامے میں سلیمان شاہ کی موت بھی دریا میں ڈوب جانے کے باعث ہوتی ہے مگر یہاں یہ قبیلہ نہ صرف اپنی نئی خیمہ بستی آباد کر چکا ہے جو کہ اسے امیرِ حلب العزیز نے عطا کی ہے بلکہ ایک زرخیز خطہ اراضی پر اپنے قبیلے کو آباد کر لینے بعد سلیمان شاہ وہاں موجود تمام ترک قبائل کا ایک اجلاس کرتے ہیں۔ تاکہ ترک قبائل کا اتحاد مضبوط بنایا جا سکے۔ یہ اتحاد اس وقت کی اہم ضرورت ہے جبکہ صلیبی اور منگول لشکر سلجوق حکومت کے ساتھ ساتھ ترک قبائل کو بھی نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ اجلاس منگولوں اور صلیبی فوجوں کے خلاف مسلم اتحاد کی غرض سے بلایا گیا ہے۔ اوغوز قبائل کا یہ اجتماع سلیمان شاہ کی دعوت پر بلایا جاتا۔ جبکہ اس موقع پر سلیمان شاہ کے دو بیٹے ارطغرل اور دوندار اس کے ساتھ ہیں۔ سلیمان شاہ موت سے پہلے دونوں بیٹوں کو قبیلے کی حفاظت اور سلجوق سلطنت کی اطاعت گزاری کی نصیحت کرتے ہیں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ والد کی وفات کے بعد ارطغرل جب اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس خراسان جانے کی بجائے اناطولیہ کی جانب پیش قدمی کرنے لگا تو اسی دوران اس نے سلجوقی دستے کی مدد کی جو بازنطینیوں سے صف آرا تھا، جس کے عوض سلطان نے خوش ہو کر اس کے قبیلے کو سوغوت میں جاگیر عطا کی اور ارطغرل کو اس علاقے کا بڑا سردار یعنی سردار اعلی بنا دیا۔ یہ واقعہ بھی ڈراما سیریل میں تاریخی واقعے کے بالکل برعکس دکھایا گیا ہے۔

اس کی پیشکش کا واقعہ یوں ہے کہ ارطغرل اناطولیہ میں اپنے قدم جما چکا ہے۔ اندرونی سازشوں، صلیبیوں، منگولوں اور بازنطینیوں کے خلاف اس کی حکمت عملیاں اور جنگی مہارتیں لاجواب ہیں۔ اس کے بڑے بڑے دشمن اس کی طاقت سے مرعوب ہوتے جا رہے ہیں اور بالآخر وہ سلطان کا اعتماد اس حد تک جیت چکا ہے کہ اب سلطان اپنے مقرب مشیر اور امیر سعد الدین کوپیک کے ہاتھوں ارطغرل کو قراجہ حصار قلع فتح کرنے پر تحائف کے ساتھ ساتھ نہ صرف بروصہ شہر اور اس سے ملحقہ جاگیر ارطغرل کو عطا کی بلکہ اسے خاص اختیارات بھی دیے جو اس سے پہلے کسی سردار اعلیٰ کو عطا نہیں ہوئے تھے۔

ڈاکٹر حمید اللہ شاہ ہاشمی اپنی کتاب "تاریخ ترکی" میں اس واقع کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ چونکہ اطغرل کی جاگیر بازنطینی سرحد سے متصل تھی اس لیے بازنطینی قلعہ داروں سے اکثر جنگ ہوتی رہتی تھی۔ ارطغرل نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی شجاعت کا سکہ بٹھا دیا۔ اس کی فتوحات کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے ترکی قبائل ایشائے کوچک میں جو پہلے سے آباد تھے، اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے اور اس کی لڑائیوں میں شریک ہونے لگے۔ اس طرح اس کی قوت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور اس کا حکم اردگرد کے علاقوں پر بھی قائم ہونے لگا۔ سلجوقیوں کو ارطغرل اور اس کے قبیلہ کی صورت میں ایک طاقت ور ساتھی مل گیا جو رومیوں کے خلاف جہاد میں بہت مضبوط ثابت ہوا تھا۔[30]

سلطان علاؤالدین کے لیے ایک جاگیر کا اس طرح قوت و اقتدار حاصل کر لینا تشویش کا باعث ہونا چاہیے تھا لیکن ایشائے کوچک میں دولتِ سلجوقیہ اختلاف اور امرا کی بغاوتوں کے سبب سے زوال کی طرف رواں دواں تھی۔ حکومت کا دائرہ عمل دن بہ دن محدود ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف تار تاریوں نے جنوبی اور مشرقی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا تو دوسری طرف عیسائیوں نے شمال اور مشرق کے قدیم بازنطینی صوبوں کے اکثر حصے واپس لے لیے

تھے۔ وسطی اور جنوبی حصے میں متعدد سلجوقی سرداروں نے خود مختار حکومتیں قائم کی ہوئی تھیں۔ سرحدی علاقوں میں جنگ کا سلسلہ اکثر جاری رہتا ہے اور تارتاری حملوں کا خطرہ کبھی دور نہیں ہوتا تھا۔ اسی صورتحال میں ارطغرل جیسے سردار کی فتوحات سے علاؤالدین کو بجائے تشویش کے ایک گونہ اطمینان نصیب ہو رہا تھا چنانچہ وہ ارطغرل کو مضبوط بنا کر اپنی حکومت کو استحکام بخشنا چاہتا تھا۔

"ہلال" سلطان علاؤالدین کے علم کا نشان تھا۔ ارطغرل نے بھی اس کے نائب کی حیثیت سے اسی نشان کو اختیار کیا جو آج تک ترکوں کا قومی نشان ہے اور بقول کریسی ہلال صدیوں تک دنیائے عیسائیت کے لیے ہیبت کی علامت بنا رہا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز نے اپنی کتاب "دولت عثمانیہ" میں ارطغرل کی عمر نوے سال بتائی ہے اور سال وفات کا تعین 1288ء کیا ہے۔ ارطغرل کا مزار ڈاکٹر صاحب نے اپنی تصنیف میں "ارطغرل" کے نام سے ایک باب شامل کیا ہے جس میں انہوں نے بھی اس واقعہ کا ذکر بالتفصیل کیا ہے۔[31] ان کے مطابق ساتویں صدی ہجری میں شاہان خوارزم کی قوت اوج شباب پر تھی اور وہ ایران و خراسان اور شام و عراق میں آلِ سلجوق کے بیش تر مقبوضات پر قابض ہو چکے تھے اور اس کی تمام سلطنتوں کو فتح کر لینا چاہتے تھے۔ لیکن عین اس وقت جب وہ اپنے اس ارادے کی تکمیل کی طرف بڑھ رہے تھے چنگیز خانی طوفان نے سلطنتِ خوارزم کو اڑا کر رکھ دیا۔ اس سلطنت کی تباہی کے بعد ترکی قبائل جنوب کی طرف لپکے۔ ان میں سے بعض ایران اور شام کی طرف گئے اور ترکمانی مشہور ہوئے۔ بعض مصر کی جانب گئے مگر وہاں انہیں شکست ہوئی تو وہاں سے ایشائے کوچک میں سلجوقیوں سے آ ملے۔ یہ ترک قبائل چنگیز خان کے حملے کے باعث مارے مارے پھر رہے تھے ان میں سے ایک قبیلہ ارطغرل کا بھی تھا۔ یہ قبیلہ ترکان اوغوز کے قبیلہ کا ایک جزو تھا جو ارطغرل کے باپ سلیمان شاہ کی سرکردگی میں اپنا وطن چھوڑ کر مختلف ملکوں میں گھومتا ہوا شام کی طرف جا رہا تھا کہ اسی دوران دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے سلیمان شاہ ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔

مندرجہ بالا تاریخی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات نسبتاً واضح ہے کہ ارطغرل ایک تاریخی شخصیت تھے۔ ان کی بہادری، سیاسی بصیرت اور جنگی مہارتیں یقیناً اس درجہ کمال کی ہوں گی کہ باوجود یہ کہ وہ محض ایک ایک خانہ بدوش قبیلے کے سردار تھے، سلجوق سلطنت ان پر انہی کمالات بشری کے باعث از مہربان

تھی۔ کئی صدیوں تک دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر حکمرانی کرنے والے اس خاندان اور سلطنت کا آغاز اور اس کی تفصیلات تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو چکی ہیں۔ مگر پھر بھی ارطغرل کا نام اور اس کی حیثیت کا یقین کرنے کے لیے جہاں عثمانی روایات پر انحصار کرنے والی تحقیقی کتابوں کی موجودگی ہمیں ارطغرل کے دور اور اس کی شخصیت کے بارے میں کچھ بنیادیں فراہم کرتی ہیں وہیں اس دور کے دو شواہد بہت ٹھوس ہیں جن میں ایک سکہ اور دوسرا بازنطینی سلطنت کے مورخ کی ایک تحریر۔ یہ سکہ جو عثمان کے دور سے ملا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ارطغرل یقینی طور پر ایک تاریخی شخصیت تھے اس سکے پر درج ہے:

"جاری کردہ برائے عثمان ولد ارطغرل"

مورخ کیرولائن فنکل اپنی کتاب "عثمان کا خواب: سلطنت عثمانیہ کی کہانی" میں لکھتی ہیں کہ "عثمان کا اپنے نام پر سکہ جاری کرنا ثابت کرتا ہے کہ وہ اس وقت صرف ایک قبائلی سردار نہیں تھے بلکہ اناطولیہ میں اپنے آپ کو سلجوق اور منگول سلطنت کے سائے سے باہر ایک خود مختار امیر سمجھنا شروع ہو چکے تھے۔"[32] فنکل کے مطابق عثمانیوں کا پہلی بار ذکر سنہ 1300ء کے قریب ملتا ہے اس وقت کے ایک بازنطینی مورخ نے لکھا ہے کہ سنہ 1301ء میں بازنطینی فوج کا سامنا عثمان نامی ایک شخص کی فوج سے ہوا۔ "جنگ باضیوس" کہلانے والی یہ لڑائی قسطنطینہ (استنبول) کے قریب لڑی گئی تھی اور اس میں بازنطینی فوج کو بری طرح شکست ہوئی تھی۔ مورخ کہتے ہیں کہ عثمانی اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ان کا علاقہ قسطنطینہ کے قریب تھا جس کی وجہ سے کسی بھی کامیابی کے باعث ایک بہت بڑا انعام عثمانیوں کو مل سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ کیرولائن فنکل نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ ارطغرل کا اناطولیہ 13ویں صدی کا اناطولیہ تھا۔ یہ ترک قبائل جب اناطولیہ پہنچے تو وہاں بہت عرصے سے کئی نسلوں اور مذاہب کے لوگ آباد تھے۔ جن میں یہودی، آرمینیائی کرد، یونانی اور عرب شامل تھے۔

اس علاقے کے مغرب میں ماضی کی نسبت ایک کمزور بازنطینی سلطنت تھی جو کبھی ایک طاقتور سلطنت تھی اور جس کا حکم اناطولیہ سے شام تک چلتا تھا۔ اور مشرق میں سلجوق جو اپنے آپ کو رومی سلجوق کہتے تھے۔ تیرہویں صدی کے درمیانی دور میں سلجوق منگولوں سے شکست کھا کر بہت کمزور ہو چکے تھے اور منگولوں کو محصول دینے پر مجبور تھے۔ لیکن اس علاقے میں محض جنگجو فوجیں ہی نہیں بستی تھیں بلکہ ہر طرح کی بود و باش رکھنے والے لوگ بھی موجود تھے۔

کیرولائن فنکل نے اپنی تصنیف میں اس زمانے کی جو تصویر کھینچی ہے وہ ڈراما سیریل ارطغرل غازی میں بڑی حد تک ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"اس علاقے میں خانہ بدوشوں، نیم خانہ بدوشوں، لیٹروں، فوجی مہمات کے شوقینوں، مختلف پس منظر والے غلاموں، درویشوں، راہبوں اور بکھری ہوئی آبادیوں کے دورے کرتے پادریوں، پناہ کی تلاش میں نکلے ہوئے بے گھر کسانوں، شہر والوں، سکون اور مقدس مقامات کی متلاشی بے چین روحوں، سرپرستی کے متلاشی مسلمان اساتذہ اور خطرات سے نہ ڈرنے والے تاجروں کی گزر گاہوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔"[33]

مزید یہ کہ اس علاقے کی خاص بات مسلمان درویشوں کی موجودگی تھی۔ مسیحی راہبوں کی طرح وہ بھی ہر وقت سفر میں رہتے یا پھر اپنے پیروکاروں کے درمیان قیام کرتے۔ درویشوں کی کھولیاں علاقے میں اسلام کی اس تصویر کی نشانی تھیں جو اناطولیہ میں سلجوقوں کی سلطنت کے سنی اسلام کے لیے عام تھا۔

سٹیفورڈ جے شاہ نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ترک خانہ بدوش جب اناطولیہ آئے تو صوفی بزرگ بھی ان کے ساتھ آ گئے۔ جس پر طاقت ور سلجوق حکمرانوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا کیوں کہ وہ ان صوفیوں کی لوگوں میں مقبولیت کی وجہ سے اپنے علاقوں سے نکل جانے پر خوش تھے۔

سوغوت کے علاقے (جو ارطغرل کو سلطان علاوالدین نے اسے عطا کیا تھا) میں ارطغرل کے نام کی ایک مسجد ہے اور اس سے ملحقہ ایک مزار بھی۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ارطغرل کے بیٹے نے ان کے لیے بنائی تھی۔ بعد میں عثمان کے بیٹے نے اس میں کچھ اضافے کیے۔ کیرولائن فنکل کے مطابق اس مسجد اور مزار پر اتنی بار اضافے اور ترامیم کی جا چکی ہیں کہ اس کے بارے میں حتمی طور پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عثمان کے دور ہی کی ہے۔

زیر تحقیق ڈرامے میں ارطغرل (جو کہ ڈرامے کا ہیرو ہے) اور ابن العربی کے درمیان گہرے روحانی تعلقات دکھائے گئے ہیں۔ ایک طرح سے ابن العربی ارطغرل کے روحانی پیشوا اور پیرومرشد دکھائے گئے ہیں۔ ڈرامے میں حلب کے سفر کے دوران راستے میں ارطغرل اور ابن العربی کی پہلی ملاقات ہوتی ہے اور پھر یہ ملاقات پیرومرشد کے رشتے میں ڈھل جاتی ہے۔ ابن العربی اپنی بصیرت سے ارطغرل میں موجود اس جوہر کو پہچان لیتے

ہیں جس کے باعث وہ امت مسلمہ کی باگ دوڑ سنبھالنے کے لیے انتہائی موزوں شخص ہے۔ ارطغرل جب بھی کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا یا دشمنوں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنستا ہے تو ابن العربی روحانی طور پر اس کی مدد کرتے ہیں۔ ابن العربی ارطغرل کو وقتاً فوقتاً قرآنی آیات پڑھ کر سناتے ہیں، ان کی تفسیر بیان کرتے ہیں اور ارطغرل کو ہر صورت شریعتِ اسلامی کے نفاذ کی تاکید کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اس کے لیے خصوصی دعائیں کرتے ہیں جو قبول ہوتی نظر آتی ہیں۔ وہ خواب کے ذریعے بھی ارطغرل کی راہنمائی اور مدد کرتے ہیں۔ جس کی برکت سے ارطغرل بڑے سے بڑے جال اور مشکل سے نکل آتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ دونوں شخصیات میں ایسا ہی تعلق و عقیدت تھی جیسی ڈرامے میں دکھائی گئی ہے؟ کیا تاریخی واقعات اور شواہد میں کوئی ایسا ثبوت بھی ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈراما میں دونوں کے مابین تعلق درست ہے یا محض تخیل کی رنگ آمیزی!

ہم نے مندرجہ بالا صفحات میں "ارطغرل غازی" کا تاریخی تناظر جاننے کے لیے دیکھا کہ مورخین نے جہاں ارطغرل کے بارے میں لکھا ہے۔ وہاں اگرچہ ابن العربی کے ساتھ اس کے تعلق کا کوئی ذکر نہیں ملتا تاہم کیرولائن فنکل، سٹیفین جے شاہ اور ڈاکٹر عبدالعزیز کی تحقیق کے مطابق ترک خانہ بدوش قبائل کی زندگی کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ جہاں جاتے صوفی بزرگ بھی ان کے ساتھ آجاتے۔ گویا اس زمانے میں تصوف اور صوفیا سے لگاؤ وہاں کی بودوباش اور کلچر میں عام سی بات تھی۔ صوفیا سے عقیدت لوگوں کے مزاج کا حصہ جہاں تک شیخ ابن العربی کی بات ہے یہ کوئی معمولی شخصیت نہیں ہیں۔ عالم اسلام ان کے افکار اور تحقیقی کاموں سے اب تک فیض اٹھا رہا ہے۔ ان کا شمار عالم اسلام کی تاریخ کے معدودے چند میں ہوتا ہے۔ اسلام کی فکری روایت میں ابن العربی اپنے مخصوص نظریہ تصوف، فلسفہ اور قوتِ کشف کے باعث ایک منفرد مقام کے مالک ہیں۔ آپ کے افکار کا دائرہ اہم سماجی اور اسلامی علوم جن میں قرآن کی تفسیر، علم حدیث، اصولِ فقہ، الٰہیات، فلسفہ، تصوف، صرف و نحو، سیرت، نفسیات، صوفیانہ شاعری، مابعد الطبیعات اور فلسفہ زمان و مکان کے افکار تک پھیلا ہوا ہے۔ کم و بیش پانچ سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ سب سے مقبول کتاب "فتوحات مکیہ" ہے۔ صوفیا ان کو شیخ الاکبر کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ان کا پورا نام محی الدین محمد ابن العربی الاندلسی ہے۔ اندلس کے شہر مریسہ میں 1165ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین عربی النسل تھے اور اندلس میں آبسے تھے۔

ایران کے معروف عالم اور محقق سید حسن نصر اپنی تصنیف Three Muslim Sages (تین مسلم فیلسوف اردو مترجم محمد منور) میں ابن العربی کے مقام و مرتبے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ابن عربی کے ظہور میں آنے کے ساتھ مابعد الطبیعیات و کونیات کے لحاظ سے بھی اور نفسیات، انسانیات کی رو سے بھی تصوف کے بارے میں ہماراواسطہ اچانک ایک ایسے وسیع الحدود اور کام نظریے سے پڑتا ہے۔ جہاں بادی النظر میں تصوف کی روایت ٹوٹتی ہوئی یا خود تصوف کے اندر ہی ایک نیاموڑ اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے"۔ [34]

محمد سہیل عمر اور سید حسن نصر نے ابن عربی کے حوالے سے اپنی تصانیف اور مضامین میں ان کے سفری حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ نیز ان کے مرتبہ علمی اور کشف و کرامات پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان غلط فہمیوں اور اضافی متون کی نشان دہی بھی کی ہے جو ابن العربی سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ بالخصوص ان کے فلسفہ وحدت الوجود کی تشریح جس طرح کی جاتی ہے ماجد فخری نے اسے صریحاً غلط فکری رویہ قرار دیا ہے۔ اور "فصوص الحکم" کے مطالعے سے جو روشن نتائج اخذ کیے ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ ان کے مطابق شیخ اکبر کا فلسفہ وحدت الوجود انسان کو اس کے اصل مقام سے شناسا کرواتا ہے۔ اس فلسفے کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان صحیح معنوں میں کائنات اصغر ہے۔ کائنات کا اصل جوہر ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ مشتِ خاک کا پتلا کائنات کی کاملیت اور صفات الہیہ کو اپنے اندر سموے بیٹھا ہے۔ اپنی اپنی خصوصایت برتر کے باعث قرآن پاک نے بھی انسان کو اپنا نائب کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ ابن عربی کے نزدیک کمال ہستی حضرت محمد ﷺ کی ہے۔ کیوں کہ آپؐ کی ذات مبارکہ میں خدا اور کائنات کی تمام جلی و خفی صفات اپنی مکمل ترین حالت میں جلوہ ہیں۔ یوں اصل شے وجود کی معرفت ہے۔ فلسفہ وحدت الوجود کا یہی وہ بنیادی زاویہ ہے جس کی درست تفہیم از حد ضروری ہے۔ یہی وجودی فلسفہ انسان کو اس کے اصل مقام سے آگاہ کرتا ہے۔ ماجد فخری اس حوالے سے ماجد فخری "فصوص الحکم" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"According to Ibn Arabi , divinity and humanity are not two distinet natures, but rather two aspects which guied their expression of every level of creation. Divinity corresponds

to the hidden or in word (batin) aspect to the crtanal or outward (zalm). In philosophical terminology, the first corresponds to rubstance , the second the accident. The manifestatition of reality reaches its communication in man".[35]

مندرجہ بالا جائزے سے ہم ابن العربی کے کرداری اوصاف اور شخصیت کے بارے میں ایک ایسا تعارف حاصل کرتے ہیں جو کسی عام شخصیت کا نہیں بلکہ انہیں اسلامی فکری روایت اور تصوف کی روایت میں بہت اعلی مقام حاصل ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا ڈرامے میں دکھائی جانے والے ابن العربی کے اوصاف و کمالات بھی ویسے ہی ہیں جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے؟ یا پھر مصنف نے زورِ تخیل سے اس میں مبالغہ آمیزی کی ہے؟ کیا ابن العربی کی ڈرامے میں پیش کش ویسے ہی ہے جیسا کہ تاریخی ابن العربی کی یا پھر یہ کوئی فکشن کا کردار معلوم ہوتا ہے۔ اور سب سے اہم یہ کہ آیا ارطغرل اور ابن العربی کے تعلقات کا کوئی تاریخی ثبوت بھی موجود ہے؟ کیا کبھی ان دونوں کی ملاقات بھی ہوئی تھی؟

پھر محض ایک کلچر اور تصوف کو دکھانے کے لیے ابن العربی کا کردار دکھایا گیا ہے۔ڈرامے میں ابن العربی کا کردار ترکی کے مشہور اداکار عثمان سرگود نے ادا کیا ہے۔ ڈرامے کے مصنف محمد بوزداغ یہ دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کے پاس اس بات کے واضح تاریخی شواہد موجود ہیں جس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ ابن العربی ارطغرل کے روحانی پیشوا تھے۔ دونوں کی ملاقات تھی اور ارطغرل کو ارطغرل بنانے میں ان کی تعلیمات، تربیت اور روحانی مدد حاصل تھی۔ تاہم انھوں نے ان شواہد کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔

محمد سہیل عمر نے اپنے ایک مضمون (جو کہ انہوں نے محمد شفیع بلوچ کی کتاب "شیخ اکبر محی الدین ابن عربی" کے دیباچے کی صورت میں لکھا ہے) میں لکھا ہے کہ ابن عربی نے زندگی کے ابتدائی ایام مرسیہ میں گزارے پھر اشبیلہ روانہ ہو گئے۔ شیخ اکبر تقریباً بیس سال کی عمر تک اندلس کے شہروں میں گھومتے رہے۔ جس دوران ان کی ملاقاتیں درویش عورتوں اور مردوں کے ساتھ ساتھ، ابن رشد کے ساتھ بھی ہوئی۔ 1198 تک ابن العربی اندلس اور شمالی افریقہ کے مختلف شہروں میں زندگی کے دن گزارتے رہے۔ اس دوران وہ تیونس تک

گھوم پھر آئے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"ابن عربی نے ایک روحانی حکم کے تحت مشرق کا رخ کیا۔ 1201 میں خانہ کعبہ کی زیارت کی۔۔۔ مکہ میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد آپ ترکی روانہ ہو گئے۔ جہاں بمقام قونیہ ان کی ملاقات صدر الدین قونوی سے ہوئی۔۔۔ 1207 میں جب مصر کے لوگوں نے آپ کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھا تو آپ نے مشرق وسطی کے اسفار اختیار کیے۔ ایشائے کوچک کی سفری مہم کے بعد دمشق کو اپنا آخری ٹھکانہ بنایا" فتوحات مکیہ "میں ان تمام عظیم شخصیت سے ملاقات اور اسفار کی تفصیلات موجود ہیں۔"[36]

جہاں تک ابن العربی کے کردار کا تعلق ہے تو یہ بات تو تاریخی شواہد سے معلوم ہو جاتی ہے کہ ان کے کرداری اوصاف میں عظمت و جلال ان کی ذاتِ صفات کی معرفت، کشف و الہام، علم نظری اور وہبی کا عمل عرفانی مشاہدات اور روحانی قویٰ کی استعداد بالکل درست ہیں۔ بلکہ ابن العربی کے حوالے سے جو جدید تر تحقیقات ہیں ان سے ان کا مقام، مرتبہ اور بھی زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ مگر جہاں تک بات ہے ابن العربی اور ارطغرل کی ملاقاتوں اور تعلقات کی تو یہ معاملہ کچھ ایسا سیدھا نہیں۔

1199ء کے بعد جب ابن العربی نے مکہ مکرمہ کا سفر اختیار کیا تو تقریباً دو سال وہ مکہ میں قیام پذیر رہے۔ یہیں انہوں نے اپنی معرکہ آرا کتاب "فتوحات مکیہ" لکھنے کا آغاز کیا۔ اس کے بعد وہ بغداد اور عراق روانہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ یہاں قیام کرنے کے بعد یروشلم کا رخ کرتے ہیں۔ ان سفروں میں ہر جگہ ان کے علم اور فلسفے کو پذیرائی ملتی ہے۔ تصوف اور علوم عرفانی کا بڑا حلقہ وہ بنا چکے ہیں۔ دمشق میں ان کی ملاقات سلطان صلاح الدین ایوبی کے بیٹے الملک الظاہر سے ہوتی ہے جو ان سے بے حد متاثر ہو کر ان کے حلقہ ارادت میں آ جاتے ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے توسط سے حلب کے امیر عبد العزیز کے ہاں بھی ابن العربی کی قدر و منزلت از حد ہے۔ (یہ وہی امیر ہیں جو ڈرامے میں بھی دکھائے گئے ہیں۔ اور جن سے ارطغرل کے تعلقات ابتداً بہت کشیدہ رہتے ہیں جس کا باعث صلیبیوں کی سازشیں ہیں تاہم بعد میں حقیقت کھلنے پر العزیز بھی ارطغرل کا معترف ہو جاتا ہے)۔

1211ء میں شیخ ابن العربی ایشائے کوچک کا سفر اختیار کرتے ہیں اور قونیہ پہنچ کر یہاں کچھ عرصہ قیام

کرتے ہیں۔ قونیہ میں آپ کا قیام تصوفِ مشرقیہ میں ایک نئی روح لے کر آیا۔ جس کا وسیلہ آپ کے شاگرد اور سوتیلے بیٹے صدر الدین قونوی ہے۔ یہ وہی صدر الدین قونوی ہیں جن کی والدہ سے ابن العربی کی شادی ہوئی۔ یہ مولانا جلال الدین رومی کے قریبی ساتھی تھے۔ آپ نے ابن العربی کی کتاب "فصوص الحکم" کی شرح لکھی جو آج تک سب سے مستند شرح تصور کی جاتی ہے۔

اب اگر مندرجہ بالا حقائق کو دیکھا جائے تو 1210ء کے بعد کا عرصہ وہ ہے جس میں ابن العربی قونیہ میں مقیم رہے۔ اور اشیائے کوچک میں تصوف اور علم روحانی کی ترغیب و تبلیغ بھی کر رہے تھے۔ اس دوران وہ دمشق، حلب، بغداد اور مکہ میں مستقل سفر کرتے رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اشیائے کوچک (اناطولیہ) میں ارطغرل غازی کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ وہ نہ صرف قائی قبیلے کا سردار بن چکا تھا بلکہ صیلیبیوں، بازنطینیوں اور منگولوں سے صف آرا تھا۔ ارطغرل کی تاریخ ولادت 1190ء ہے جبکہ ابن العربی کی تاریخ ولادت 1165ء ہے۔ ابن العربی اندلس سے تقریباً 1200ء کے بعد آئے ہیں۔ ارطغرل کی سرگرمیاں 1210ء کے بعد سے آغاز ہوتی ہیں اور اسی زمانے میں ابن العربی بھی قونیہ میں اور حلب میں موجود رہتے ہیں۔ لہذا یہ بات واضح ہے کہ دونوں کے زمانے میں ایسی تفاوت نہیں کہ ملنا محال ہو۔ اور پھر عمروں کا یہ فرق مقام و مرتبہ اور تعلق کی بنیاد پر (ابن العربی راہنما ہیں اور ارطغرل مرید شاگرد) عین نیچرل محسوس ہوتی ہے۔ ابن العربی کا سالِ وفات 1240ء ہے۔ اور 1220ء سے 1240ء کا زمانہ ارطغرل کا عہد شباب ہے۔ جس میں وہ اپنی سیاسی اور جنگی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے رہا ہے۔ سو ان شواہد کی روشنی میں دونوں کی ملاقاتیں بعید از قیاس نہیں کہ جب ارطغرل اناطولیہ میں ہے اور ابن العربی قونیہ میں۔ ڈرامے میں بھی یہی دکھایا گیا ہے کہ دونوں کی ملاقات قونیہ سے حلب یا دمشق جاتے ہوئے ہوتی ہے۔ قونیہ پایہ تخت ہے جبکہ حلب کو سیاسی اہمیت حاصل ہے۔ سلجوق سلطنت حلب سے اپنے احکامات جاری کرتی ہے۔ ارطغرل کو اکثر قونیہ اور حلب جانا پڑتا ہے۔ ادھر ابن العربی بھی قونیہ سے حلب جاتے ہوئے اناطولیہ میں موجود قائی قبیلہ میں موجود ارطغرل سے ملاقات کر کے جاتے ہیں۔

ڈرامے کے پہلے سیزن سے لے کر چوتھے سیزن تک دونوں کی ملاقاتوں کا تسلسل دکھایا گیا ہے۔ اور یہ عہد 1210ء کے بعد سے لے کر 1240ء تک کا ہے۔ اس دوران ارطغرل جوان ہے اور ابن العربی معمر شخص ہیں۔ ادھر ڈرامے کے مصنف بوزداغ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے پاس تاریخی شواہد موجود ہیں جن سے دونوں

شخصیات کی ملاقات اور تعلقات ثابت ہوتے ہیں تاہم وہ شواہد کیا ہیں؟ اس پر وہ روشنی نہیں ڈالتے۔ ڈرامے میں ابن العربی کا کردار عثمان سویقوت نے ادا کیا ہے جو ترک نژاد امریکی اداکار ہیں۔

ظاہر ہے مندرجہ بالا تاریخی حوالوں کے نتیجے پر یہ بات یقینی طور پر کہنا مشکل ہے کہ ابن العربی اور ارطغرل کے درمیان معاملات کی نوعیت ڈرامے میں پیش کی گئی نوعیت کے مطابق تھی۔ کیوں کہ محض وقت یا زمانے کی مطابقت کسی حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے ناکافی ہے۔

ابن العربی جیسی عظیم المرتبت شخصیت جنھوں نے اپنے تمام سفروں کا حال اور اس دوران مختلف النوع شخصیات سے ملاقاتوں کا حال اپنی تصانیف میں تفصیلاً بیان کیا ہے۔ بالخصوص "فتوحاتِ مکیہ" اور "فصوص الحکم" میں تو انہوں نے خواتین درویشوں سے ملاقات کے ساتھ ساتھ اپنے ایسے ایسے روحانی تجربات کے بارے میں تفصیلاً لکھا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ابن رشد سے ان کی محض دو ملاقاتیں ہوئیں جن کا تفصیلی بیان فتوحات مکیہ میں موجود ہے۔ پھر قبل از مسیح کے روحانی اقطابِ وحی کا مشاہدہ اور عرش الٰہی کی زیارت کا تذکرہ بھی اس کتاب میں موجود ہے جس میں انہوں نے دیکھا کہ ایک پرندہ عرش کے گرد محوِ پرواز ہے اور عرش کو نوری ستونوں نے اٹھار کھا ہے۔ یہ انکشافات کوئی معمولی نوعیت کے نہیں۔ مگر ابن العربی نے ان کو بھی برملا تفصیلاً اپنی تصانیف میں جگہ دی تو پھر سوال یہ ہے کہ ارطغرل غازی جو ان کے تصورِ فوق البشر کا اظہار ہے، اس کی قیادت پر مسلم امہ کے اتحاد کا انحصار ہے، وہ جوہر یکتا ہے جو مستقبل قریب میں اتحاد مسلم کا باعث بننے والا ہے۔ شیخ ابن العربی اسے دیکھتے ہی پہچان جاتے ہیں کہ یہی وہ مردِ مومن ہے جو انسانِ برتر ہے۔ جو ساری کائنات پر محیط ہے۔ وہ جسم وروح کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔

غرض ارطغرل کی ذات میں موجود امکانات کے ایک بحر بے کراں کو اپنے کشف اور نظر سے جاننے کے بعد ابن العربی ارطغرل کو مسلمانوں کے نجات دہندہ کے طور پر چن لیتے ہیں۔ اسے مقدس امانتیں عطا کرتے ہیں۔ یہ مقدس امانتیں اتنی بابرکت ہیں کہ صاحبِ امانت ہر مصیبت سے نکل کر کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور یہ اتنی اہم اور قیمتی ہیں کہ عیسائیوں کے مذہبی راہنما مدت سے ان کے پیچھے سرگرداں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سلطان علاؤ الدین کا بیٹا غیاث الدین ارطغرل کے دشمنوں کی سازش کا شکار ہو کر ارطغرل کو سزائے موت سنانے جا رہا ہے تو عین اس وقت ابن العربی دربار میں پہنچ جاتے ہیں اور ارطغرل کی بے گناہی کا یقین دلاتے ہوئے اسے موت کے

منہ سے باہر نکال دیتے ہیں۔ یہ تمام واقعات اپنی نوعیت اور اہمیت میں غیر معمولی ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ ابن العربی کی کسی تصنیف میں ایسی ایک بھی ملاقات کا تذکرہ نہیں۔ کجا یہ کہ ابن العربی ارطغرل کے راہنما ہیں تاکہ وہ پوری امتِ مسلمہ کا راہ نما بن سکے!

عین ممکن ہے کہ مصنف ابن العربی کے تصورات و افکار سے ازحد متاثر ہو اور اس نے ان افکار و تصورات کو مرکزی اہمیت دیتے ہوئے ان کی ترویج کے لیے ابن العربی کے کردار کو ڈرامے کا حصہ بنایا ہو۔ یہ بجا کہ مصنف تاریخ کا ایک طالب علم ہے اور بقول اس کے اسلامی تعلیمات اور قرآن کی تعلیم اسے بچپن ہی سے خاندان سے وراثت میں ملی۔ مصنف کے تاریخ میں بی۔ایس تک تعلیم حاصل کی ہے۔ مگر وہ تاریخ کے محقق نہیں، ناقد نہیں۔ البتہ فکشن نگار کے طور پر بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگرچہ ابن العربی کی پیشکش کا دورانیہ اور ان کے کرداری اوصاف بلاشبہ تاریخی ہیں مگر ارطغرل غازی کے ساتھ ابن العربی کی ملاقاتیں محض تخیل کے زورِ پرواز کا نتیجہ ہے۔ تخیل کی یہی زرخیزی فکشن کو حقیقت سے قریب تر کرکے دکھاتی ہے۔ اور تاریخ کے خلا کو پر کرنے کے لیے اسے اپنی مرضی کے رنگوں میں ڈھال کر اس طرح پیش کرتی ہے کہ اصل سے زیادہ خوب صورت اور نظر نواز تصویریں بنا دیتی ہے۔ ڈراما سیریل ارطغرل غازی میں بھی دونوں کرداروں کے مابین معاملات اور تعلقات تاریخی نہیں بلکہ تخیلاتی معلوم ہوتے ہیں۔

### د: فکشن بطور تاریخ کے تصورات کی روشنی میں ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کا جائزہ

سابقہ صفحات میں تاریخ اور فکشن کے بنیادی مفہوم وظائف سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہم نے تاریخ اور فکشن میں باہمی ارتباط اور تفاوت کے موضوعات پر مفکرین کی آرا جاننے کی کوشش کی۔ فکشن اور تاریخ ہر چند علیٰحدہ علیحدہ شناخت اور دائرہ کار رکھتے ہیں مگر اس کے باوصف دونوں میں اشتراک و امتزاج ایسا ہے کہ بسا اوقات تاریخ میں افسانہ اور افسانے میں تاریخ کا دخل اس خوبی و شدت کے ساتھ آجاتا ہے کہ پھر تاریخی حقائق پیچھے رہ جاتے ہیں۔ تاہم یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ فکشن ایک صنفِ ادب ہے اسے مکمل طور پر نہ تو تاریخ کا درجہ حاصل ہے اور نہ ہی فکشن نگار کو ایسا کرنا چاہیے۔ فکشن میں تاریخی عناصر کی موجودگی قاری کی دلچسپی اور

مسرت کے لیے ہوتی ہے نہ کہ اسے تاریخ کے حقائق سے متعارف کروانے کے لیے۔ فکشن چاہیے تاریخی ہو وہ اسے ہر صورت پہلے فکشن ہونا چاہیے اور پھر کچھ اور۔ فکشن نگار ہمیشہ تخیل کی مدد سے اپنی کہانی کو دلچسپ بناتا ہے۔ اس کی پہلی کاوش اس کی تحریر کو فکشن بناتی ہے۔ یہ کہانی سچ اور جھوٹ سے ماورا ہوتی ہے۔ جبکہ سچ یا حقیقت محض ایک تاریخی دستاویز یا تاریخی شواہد بن سکتی ہیں۔

اسی طرح مورخوں نے تاریخ کی تعریف اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق کی ہے۔ یونانی مورخ ہیروڈرٹس (Herodotus) جسے تاریخ کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے کے نزدیک تاریخ میں مشاہدہ سب سے اہم ہے۔ سو ان کی تاریخوں میں کہانیوں کا سا ماحول اور بیان ہے۔ تھیوسی ڈالڈس اسی دور کے دوسرے بڑے مورخ ہیں۔ ان کے نزدیک سیاسی معاملات تاریخ میں سب سے اہم ہیں۔ تاریخ نویسی ناصحانہ انداز و بیان کی حامل ہے۔ نیز ان کے نزدیک تاریخ اسی وقت موثر ہو سکتی ہے جب وہ اپنی اصلی شکل میں ہو۔

ابن خلدون کے مطابق تاریخ کسی عہد یا نسل کے متعلق مخصوص روایات کا بیان ہے۔

جدید فنِ تاریخ کے بانی جرمنی کے لیع پولڈ واں رانکے (leo pold van rank) نے تاریخ لکھنے کا ایک نیا تصور متعارف کروایا۔ ان کے نزدیک حقیقتوں کو پہلے معیار پر تولنا چاہیے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں بیسویں صدی کے آغاز سے ہی یہ بات زیر بحث ہے کہ آیا تاریخ مکمل طور پر معروضی ہو سکتی ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے کہ کیوں کہ اس میں بہر حال داخلیت بر قرار رہتی ہے۔ 1912ء میں جیمس ہاروے نے یہ رائے دی کہ مورخ کو یہ استحقاق ہے کہ وہ جن واقعات اور حقائق کو اہم جانے ان کا انتخاب کر لے۔

جدید تصور تاریخ کے مطابق یہ محض بادشاہوں کی داستان نہیں بلکہ تہذیبی رفتار کا آئینہ ہے۔ جس میں گزرا ہوا زمانہ اپنے تمام مسائل و معاملات نظریات وعقات اور کلچر کے ساتھ منعکس ہوتا ہے۔ تاریخ نگاری فکشن کے بر عکس سنجیدگی، ثبوت اور شہادت کی متقاضی ہوتی ہے۔ لہذا ایک فکشن نگار نہ تو مورخ ہوتا ہے اور نہ ہی حقائق کی دریافت اس کا مسئلہ! یہی وجہ ہے کہ جب ہم تاریخی فکشن نگاری کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو چند جزوی اختلافات کے علاوہ کم و بیش تمام فکشن نگاروں کے ہاں فکشن بطور تاریخ کے تصورات ایک سے ہیں۔ جن کی بنیاد پر ان کے تاریخی فکشن کی رنگارنگ عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

اردو میں چونکہ تاریخی ناول نگاری مغرب سے آئی لہذا اگر سر والٹر سکاٹ اپنے تاریخی ناولوں میں

حقیقت اور تخیل کے امتزاج کو برتتے ہیں وہیں وہ تاریخی واقعات کی سچائی کے لیے کبھی اسناد اور حوالے نہیں دیتے۔ ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں نے ان تاریخی ناولوں کے بارے میں لکھا ہے کہ: "اس کو جب کوئی حقیقت یاد نہیں آئی تھی تو وہ دوسری ایجاد کر لیتا تھا"۔[37]

دوسری اہم بات جو اسکاٹ کے ناولوں میں موضوع بنی وہ کوئی نہ کوئی کشمکش یا کشاکش ہے۔ خواہ یہ کشمکش مذہبی عقائد کے تصادم سے پیدا ہو، معاشرتی تبدیلیوں کے درمیان پرانے اور نئے خیالات کی ٹکر ہو یا پھر سیاسی نظریات کی بنیاد پر مختلف گروہوں کی کھینچا تانی ! یا پھر سٹیٹ اور چرچ کے درمیان رسہ کشی۔

الیگزینڈر پوشکن روسی تاریخی ناول نگار ہے۔ جن کے ناولوں میں اپنے کلچر اور وراثت پر فخر بنیادی موضوع نظر آتا ہے۔

مختلف ہندوستانی زبانوں کے تاریخی ناول نگاروں میں بنکم چندر چٹر جی حیثیت ایک پیش رو کی مانند ہے۔ ناقدین انہیں پہلا باقاعدہ ہندوستانی تاریخی ناول نگار بھی کہتے ہیں۔ انہیں بنگال کا والٹر سکاٹ بھی کہا جاتا ہے۔ بنکم چندر اپنے ناولوں میں اپنے نظریات اور عقائد کے ساتھ ساتھ اپنی پسندیدگی کی بنیاد پر تاریخی حقائق کو پرکھنے کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تاریخی ناولوں میں مسلمانوں کے ساتھ رویہ بہت معاندانہ نظر آتا ہے۔ وہ مسلم کرداروں کی تصویر کشی بزدل، ظالم، حریص اور جابر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ ان کے ہاں افسانہ تاریخ میں صورت میں نظر آتا ہے۔ وہ اپنے عقائد اور خواہشات کو تاریخی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

بھگوان گڈوانی کو ہندوستانی تاریخی ادب میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کے تاریخی ناولوں میں حقیقت کی تلاش بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ ان کے نزدیک تاریخی فکشن میں غیر جانبدار مورخ کی طرح مخصوص دور کے تاریخی واقعات کی حقیقت اور کرداروں کی اصلیت دریافت سب سے اہم ہے۔ وہ تاریخی فکشن کے لیے تاریخی تحقیق اور چھان پھٹک کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی ریسرچ کے مواد کو اکٹھا کر کے اس میں اپنے مطلب کے خاص خاص واقعات نکال لیتے ہیں۔ جن کو تراش خراش کر اس طرح جوڑتے ہیں کہ اپنے کردار کی ایسی تصویر بنائی جا سکے جو قاری کے دل کی گہرائیوں کو چھو لے۔

کلئیر لینگلی ہاوتھون (Clare Langly Haw Throne) امریکی تاریخی ناول نگار ہیں۔ انہوں نے نہ صرف تاریخی ناول لکھے بلکہ اپنے مضامین میں وہ تاریخی فکشن پر تنقید بھی لکھتی ہیں۔ اپنے ایک مضمون "Using

”Real People in Histroical fiction J میں لکھتی ہیں:

“Some Novels become more faction than fiction , when they use historical figuras as material for their novels , speacially where they try to stick to the historical records as accurately as possible”.[38]

آگے چل کر وہ اسی مضمون میں لکھتی ہیں کہ تاریخی شخصیات کو سپرنگ بورڈ کی طرح استعمال کرنا چاہیے نہ کہ ٹک کے طور پر۔ مارگریٹ ایٹ وڈ (Margrate At Wood) امریکہ میں تخلیقی لکھائی کی استاد ہیں۔ اپنے ایک مضمون Historical Fiction / Fictionalizing History میں لکھتی ہیں کہ "تاریخ کی قیاس آرائی مصنف کو سچائی سے انحراف کی بہت زیادہ اجازت دیتی ہے"۔[39]

عبدالحلیم شرر تاریخی ناولوں کے ذریعے مذہبی وجوش وخروش اور حمیت اسلامی کی بیداری چاہتے تھے۔ ان کے مطابق تاریخی ناول کے ذریعے قومِ اسلام کے ایسے کارنامے دکھانے چاہیں جو بجھے ہوئے جوشوں اور پژمردہ حوصلوں کو از سرِ نو زندہ کرسکتے ہیں۔

تاریخی ناول کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں میں مذہبی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے کا خیال شرر کے بعد نسیم حجازی کو آیا۔ انہوں نے بہت دلکش انداز میں تاریخ کو رومانوی فکشن کے ساتھ ملا کر تاریخی ناولوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ ان کے ناول "خاک اور خون" پر ایک فلم اور ان کے دو ناولوں "شاہین" اور "آخری چٹان" پر پی ٹی وی نے ڈرامے بھی بنائے۔

گویا اردو تاریخی فکشن میں بنیادی چیز اپنے نظریے اور مذہبی اعتقادات کی پیشکش سب سے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ یہ رجحان اردو تاریخی فکشن نگاروں کی اختراع ہے۔ بلکہ ہم نے تاریخی فکشن کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھا کہ قدیم ایرانی تاریخی فکشن ہو، یورپ میں لکھا گیا تاریخی فکشن ہو یا برصغیر میں، کم و بیش سب تاریخی فکشن لکھنے والوں کے ہاں قومی اور مذہبی اعتقادات بہت اہم رہے ہیں۔ وہ نہ صرف قومی حمیت و برتری دکھانے کے لیے تاریخی فکشن کو ایک زبردست آلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں بلکہ مذہبی عقائد اور جوش وخروش تبلیغ و تشہیر کے لیے تاریخی فکشن بہت موثر کردار ادا کرتا رہا ہے۔

تاریخی فکشن نگاری میں وقت، ماحول اور دور کی پیشکش بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ تاریخی فکشن کا سب سے بڑا کرزما اور رومانس بیان کیے گئے وقت کی پیشکش ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق تاریخ کو پیش کرتے ہوئے اس وقت کا صحیح ماحول، رہن سہن، گفت شنید کے آداب، محاورے، کھانے پینے کے انداز اور خوراکیں، پہناوے، لڑنے، جنگ کرنے یا زندگی کے کسی دوسرے اہم کارنامے کو پورے طور پر واضح کرنے اور ان کا مکمل نقشہ پیش کرنے کے لیے تاریخ کو لاشعوری طور پر ناول کا سہارا لینا پڑا۔ آگے چل کر وہ اس بحث کا یہ نتیجہ لگا لئے ہیں کہ ناول کی مقبولیت اور مقصدیت کو دیکھتے ہوئے مورخین کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ تاریخ کو جتنی کامیابی تاریخی ناول کے ذریعے مل سکے گی اور کسی صنف کے ذریعے نہیں۔

یہ بات تو طے ہے کہ تاریخی فکشن ماضی کے کسی دور سے متعلق ہوتا ہے۔ مگر یہ ماضی قریب بھی ہو سکتا ہے اور بعید بھی، تاریخ کے کسی نامعلوم دور کو بھی موضوع بنایا جا سکتا ہے اور زمانہ قدیم کو بھی مگر ان سب ادوار کا کلچر اور ماحول پیدا کرنا کسی بھی فکشن نگار کا ایک امتحان بھی ہوتا ہے اور کامیابی کی ضمانت بھی۔

فکشن کا بنیادی وظیفہ مسرت کا حصول ہے اور یہ مسرت کہانی کے توسط سے میسر آئی ہے۔ فکشن چاہے تاریخی ہو یا غیر تاریخی بحر حال کہانی اس میں مرکزی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ تاریخی فکشن کو بھی تاریخی واقعات کا ڈھیر نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی فکشن نگار کسی مورخ کی طرح سنین اور واقعات کے وضوع کو بنیادی اہمیت دیتا ہے بلکہ وہ کہانی کے تسلسل اور کہانی پن کو جاری رکھنے کی خاطر تاریخی واقعات میں تغیر اور اضافے بھی کرتا ہے۔ تاریخی فکشن میں حقائق کی پیشکش تاریخی حقائق سے وسیع تر ہوتی ہے۔ ان حقائق کے بیان میں ایک مورخ یا محقق کا نکتہ نظر نہیں بلکہ فکشن نگار کا زور تخیل درکا ہوتا ہے۔ لہذا تمام واقعات اور کرداروں کی پیشکش میں لچکدار رویہ رکھنا فکشن نگار کی ہی نہیں بلکہ ضرورت اور فنکارانہ چابک دستی کا ثبوت بھی ہوتا ہے۔ اور کلئیر لینگلیی ہاوتھون کے بقول : "Idi, Howeven, enjoy channeling real people and their stories to creat my own characters." لہٰذا ایک تاریخی فکشن نگار کسی بھی حقیقت کے بیان تک محدود نہیں رہ سکتا، وہ واقعات ترتیب دیتا ہے، کردار تخلیق کرتا ہے اور اپنے تخیل سے ایک ایسی تصوراتی دنیا تخلیق کرتا ہے جو تاریخی ہونے کے باوجود حال کے قاری کے لیے سب سے بڑی حقیقت بن جاتی ہے۔ پھر چاہے وہ امتیاز علی تاج کی انارکلی ہو یا جلال الدین اکبر کی "جودھا" جن کی موجودگی مورخین جتنا بھی جھٹلائیں وہ قارئین

کے لیے سب سے بڑی خوش کن حقیقتیں ہی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ بھی وہی تاریخ کی قیاس آرائی ہے جو مصنف کو سچائی کے انحراف کی بہت زیادہ اجازت دیتی ہے۔

مندرجہ بالا جائزے کی روشنی میں ہم فکشن بطور تاریخ کے تصورات کے مندرجہ ذیل نکات ترتیب دے سکتے ہیں:

i. فکشن نگار تاریخی حقائق کا پابند نہیں ہوتا

ii. حقائق کی دریافت اور تحقیق تاریخی فکشن کا دائرہ عمل نہیں۔

iii. تاریخی فکشن کی پیشکش کے پیچھے کوئی نظریہ حیات، مذہبی جوش یا قومی حمیت کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔

iv. تاریخی فکشن کا بنیادی وظیفہ مسرت کا حصول ہے لہذا اس میں کہانی مرکزی اہمیت رکھتی ہے۔

v. تاریخی فکشن میں عہد اور وقت کی پیشکش میں کلچر کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

vi. تاریخی فکشن تاریخ اور تخلیق کا امتزاج ہوتا ہے۔

vii. تاریخی فکشن میں حقائق کی پیشکش تاریخی حقائق سے وسیع تر ہوتی ہے۔

# حوالہ جات


1۔ تھامس کارلائل، علمِ تاریخ، آزاد دائرہ المعارف، ویکیپیڈیا
2۔ برٹرینڈ رسل، علمِ تاریخ، آزاد دارئرہ المعارف، ویکیپیڈیا
3۔ خلیل الرب، پروفیسر، تاریخ کا مطالعہ کیسے کیا جائے، دار الشعور، 2000، ص12
4۔ مبارک علی ڈاکٹر، بیسویں صدی میں تاریخ نویسی (مضمون) تاریخ کی آواز، فکشن ہاؤس، لاہور 2004، ص25
5۔ نپولین بوناپارٹ کے اقتباسات۔

https://www.currentschoolnews.com/ur/quote/napoleon-bonaparte-/quotes

6۔ خلیل الرب، پروفیسر، تاریخ کا مطالعہ کیسے کیا جائے، ص27

7. Fiction Defination & meaning britanica Dictionary.

https://www.britannica.com/dictionary/fiction#:~:text=Britannica%20Dictionary%20definition%20of%20FICTION,great%20works%20of%20fiction

8. Fiction Dictionary & meaning, Cambridge English Dictionary

https://dictionary.cambridge.org/dictionary/english/fiction

9۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2019، ص18
10۔ آل احمد سرور، پروفیسر، فکشن، کیا، کیوں اور کیسے (مضمون) ریختہ اُردو

https://www.rekhta.org/articles/fiction-kya-kyun-aur-kaise-aale-ahmad-suroor-articles?lang=ur

11۔ ریڈرڈائجسٹ، شمارہ3، 2013، ص58
12۔ ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر، اردو فکشن کی تنقید، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، 1996، ص4
13۔ رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، اردو میں تاریخی ناول، ابلاغ، لاہور، 1999، ص88
14۔ ایضاً، ص88

15۔ اورنگزیب عالمگیر، ڈاکٹر، رئیس احمد جعفری، بک کارنر، جہلم 2007، ص300

16۔ عبدالحلیم شرر، ملک العزیز ورجنا، جے ایس سنت سنگھ اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص21

17۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، بابر بک ایجنسی، دہلی جون، 1972، ص55

18۔ ایضاً

19۔ ایضاً

20۔ مغلِ اعظم (فلم) https://www.youtube.com/watch?v=e7hP9UNp0Hw

21۔ غرناطہ (فلم) https://www.youtube.com/watch?v=zzOguX1JKfg

22. James TOD, Annals and Antiquitiws of Rajast'han, George Rouhedge & sons limited London, 1914.

23۔ جودھا اکبر (فلم)

24. Jack G. Shaheen, Reel Bad Arabs, Olive Branch Press, Jan 2001

25۔ احمد خان، ڈاکٹر، قاضی عبدالستار، فن اور فنکار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2005، ص9

26. Finkel, Caroline, Osman,S Dream, The Story of the Olloman Empire, 1300-1923, Baric books, 2005.

27. Stanzord Jay Shaw, Hostory of the Ottoman Empire and Modern Turkey, Cambridge University Press, 1976

28۔ حمید اللہ شاہ ہاشمی، تاریخ ترکی، مکتبہ دانیال، لاہور، س ن، ص15

29۔ ایضاً، ص17

30۔ ایضاً، ص18-20

31۔ محمد عزیز، ڈاکٹر، دولتِ عثمانیہ، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ہند، طبع جدید، 2009، ص22

32. Finkel, Caroline, Osman,S Dream, The Story of the Olloman Empire, 1300-1923, Baric books, 2005.

33۔ ایضاً

34۔ حسین نصر، سید، یتن مسلمان فیلسوف، محمد منور (مترجم) علاقائی ثقافتی ادارہ (آر۔سی۔ڈی) تہران، (لاہور) 1972، ص1-8

35. History of Islamic Philosophy by mayid Fakhiy, Columbia University Press, New York 1983, p.253

36۔ شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی، محمد شفیع بلوچ، دیباچہ محمد سہیل عمر مکتبہ جمال، لاہور، 2001، ص53

37۔ نزہت سمیع الزماں، ڈاکٹر، تاریخ اور افسانہ، ص22

38. Clare Langly Haw Throne, Uring Real People in Historical Fiction (essay)

39۔ ایضاً

باب سوم

# ہیرو کے تصور کی روشنی میں ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کا مطالعہ

## الف: تاریخ میں ہیرو کا تصور

مؤرخین کا ایک گروہ یا مکتبہ فکر تاریخی عمل اور اس کی تشکیل سازی میں عظیم افراد کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ ان کے مطابق تاریخ عظیم لوگوں کی داستان ہے۔ یہ عظیم الشان حکمران، فوجی جرنیل، بادشاہ یا پھر سیاستدان ہوتے ہیں۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان عظیم لوگوں کی فہرست بھی بڑھتی گئی اور محض حکمران طبقے تک محدود نہیں رہی اور ان میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں موجود نمایاں ترین لوگ بھی شامل ہوتے گئے۔ یوں سائنس دانوں، مفکروں اور شاعروں کو بھی عظیم لوگوں میں شمار کیا جانے لگا۔ مگر اس کے باوجود اس مکتبہ فکر کے ہاں عظیم لوگ اپنے افکار اور نظریات کی بجائے اپنے عمل کی مناسبت سے اہم ہوتے ہیں۔ لہذا جو کردار اپنے عمل سے انسانی زندگی میں کوئی مثبت تبدیلی لاتے ہیں اور حالات کو بدل کر رکھ دیں وہی تاریخ کے صفحات میں بطور "ہیرو" اپنے نام کا لوہا منواتے ہیں۔ جب تاریخ کو عظیم افراد کے کارناموں کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو تمام تر واقعات سمٹ کر ان شخصیات کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے تاریخی عوامل میں پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ ایسی تاریخ نویسی کے نتیجے میں لوگوں میں ہیرو کے تصورات اور ہیرو پرستی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اس عظیم شخص "ہیرو" کے سحر میں اس طرح گرفتار دکھائی دیتے ہیں وہ اپنی ذات کو بھلا کر اپنی تمام تر صلاحتیوں کو اپنے ہیرو کے سپرد کر دیتے ہیں اور وفور جذبات میں اسے اتنا عظیم بنا دیتے ہیں کہ خود ان کا وجود ہیرو کی ذات میں گم ہو جاتا ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق:

"A person who is admired for his courage, outstanding achivements or noble qualities".[1]

اس کا مترادف ہے Brave man یا Champion اور اس کا متضاد Coward یعنی بزدل ہے۔

آل احمد سرور اپنے ایک مضمون میں "فکشن کیا ہے؟ کیوں؟ اور کیسے؟" میں نارتھ روپ فرائی کا حوالہ دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس نے ہیرو کی درجہ بندی اس طرح کی ہے۔:

- سب سے پہلے وہ ہیرو آتے ہیں جو انسان نہیں دیوتا ہیں۔
- دوسرے نمبر پر وہ ہیروز ہیں جو انسان ہیں مگر عام انسانوں سے بہت زیادہ طاقتور، زیرک اور معاملہ فہم ہیں۔
- تیسرے نمبر پر ہماری طرح کے انسان (عام انسان) ہیں۔
- سب سے آخر میں ایسے ہیروز ہیں جنہیں مشکل سے ہیرو کہا جا سکتا ہے۔یعنی وہ عام لوگوں سے بھی کم عقل اور تھوڑی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔[2]

اگر ہم عالمی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہیروز میں سب سے نمایاں شکل سیاسی اور عسکری ہیروز کی نظر آتی ہے۔جو اپنی جنگی اور سیاسی صلاحیتوں کے باعث دنیا کے جغرافیے کو تبدیل کر دیتے ہیں۔مثلاً نپولین بوناپاٹ جس نے اپنی فوجی مہمات کے ذریعے یورپ کے نقشے کو بدل کر رکھ دیا اور ایک ایسی سیاسی و سماجی تبدیلی کا آغاز کیا جس نے یورپ کی تاریخ پر گہرے اثرات ڈالے۔نارتھ روپ فرائی کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو نپولین جیسے ہیروز کا شمار دوسرے نمبر پر موجود ہیروز میں ہوتا ہے جو انسان ہیں مگر غیر معمولی صلاحیتوں سے متصف ہیں۔زیادہ طاقتور، زیرک اور معاملہ فہم ہیں۔ اور عام طور پر یہ ہیروز فوجی ہیرو کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔ جیسے پنجاب کے راجا پورس، مہاراجہ اشوک اعظم، مہاراجہ رنجیت سنگھ اور پنجاب کا دُلا بھٹی وغیرہ۔

'Great Man Theory' تاریخ کے مطالعے کے لیے انیسویں صدی میں پیش کیے جانے والا ایک نظریہ ہے۔یہ نظریہ سکاٹ لینڈ کے فلسفی، مورخ اور مضمون نگار تھامس کارلائل نے پیش کیا تھا۔کارلائل نے 1840ء میں ہیرو ازم پر لیکچرز کا آغاز کیا جو بعد میں On Heroes, Hero-worship and the Heroic in History کے نام سے کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔بنیادی طور پر کارلائل نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ تاریخ عظیم لوگوں کی داستان ہے۔وہ ان عظیم لوگوں کو "ہیروز" کے نام سے یاد کرتا ہے اور انہیں چھ اقسام میں بیان کرتا ہے:[3]

1. The Hero as divinity

2. The Hero as prophet
3. The Hero as poet
4. The Hero as priest
5. The Hero as man of letters
6. The Hero as king

کارلائل نے ہیرو کی خصوصیات ان الفاظ میں بیان کی ہیں:

1۔ ہیرو ایک عظیم آدمی ہے جو روشنی کا چشمہ ہے۔
2۔ ان کی روشنی سے ہی دنیا کے اندھیرے ختم ہوئے۔
3۔ ہیرو مردانگی، بہادری اور بصیرت کا مجموعہ ہوتا ہے۔
4۔ ہیرو جب کسی مسئلے سے دوچار ہوتا ہے تو وہ ذہنی ہمت دکھاتے ہوئے مسئلے کا حل نکالتا ہے۔
5۔ دوسروں کی مدد کرتا ہے۔ شدید خطرے سے دوسروں کو بچاتا ہے۔
6۔ دوسروں میں مشکلات سے گزرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔

استقامت، طاقت، بہادری، صبر، بے لوثی، ذہانت اور ایمانداری ہیرو کے عمومی اوصاف ہیں۔ کارلائل کے الفاظ میں

> "ایک ہیرو وہ ہوتا ہے جو دوسروں کی ہر حال میں مدد کرتا ہے۔ اگرچہ ایک ہیرو میں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں۔ جیسا کہ بہادری، حوصلہ، جرات، طاقت، ذہانت اور وقار مگر یہ سب ایک ہیرو کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کا دل پاک ہونا چاہیے، وہ انسانیت کی فلاح کے لیے لڑتا ہے نہ کہ انتقام کے لیے!"[4]

اور سب سے اہم خصوصیت جو ایک عظیم انسان کو ہیرو بناتی ہے چاہے یہ عظیم انسان divinity hero ہو، prophet hero ہو، poet hero ہو، priest hero یا man of letter ہو، وہ ہے "راہنمائی" یہ تمام عظیم لوگ لیڈرز ہوتے ہیں۔ یہ جس بھی شعبہ حیات سے وابستہ ہوں اپنی دنیا آپ پیدا کرنے والے اور رجحان ساز ہوتے ہیں۔ وہ نئے نقش بناتے ہیں۔ وہ بنے بنائے راستوں سے انحراف کرنے کے ساتھ ساتھ نئی دنیاؤں کی تعمیر

کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ہیرو ایک لیڈر بھی ہوتا ہے۔ گویا ہیرو کے لیے لیڈر شپ کی خصوصیت کا حامل ہوتا ہے ضروری ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر لیڈر ایک ہیرو بھی بن جائے!

کارلائل کا پہلا لیکچر Hero to Divinity پر مشتمل ہے۔ جس میں وہ بیان کرتا ہے کہ ہیرو وہ ہوتا ہے جو گاڈ کی طرح یا گاڈ کی دی ہوئی طاقتوں کا استعمال کرتے ہوئے کائنات میں پھیلے ہوئے اسرار کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس فہرست میں اس نے Odien اور Hercules کو شامل کیا ہے۔ اس کے مطابق یہ دونوں دیوتائی قوتوں کے حامل انسان تھے جنہوں نے اپنے ارد گرد پھیلے ماحول میں قدرت کے اسرار و رموز جاننے کی کوشش کی، اس کے لیے انہوں نے سوچنے اور سمجھنے کا طریقہ اختیار کیا اور جو کچھ انہوں نے اس سے اخذ کیا اسے اپنے لوگوں تک پہنچایا۔ انہوں نے لوگوں کو قوت اور طاقت کا راستہ دکھایا، ان کی راہنمائی کی، یہ دونوں ہیرو دراصل Demigod یا فوق البشر تھے۔

ٹالسٹائی نے اپنی کتاب "جنگ اور امن" میں تاریخ میں عظیم افراد کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔[5] وہ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ عظیم افراد تاریخ ساز ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک تاریخ عظیم انسانوں کی داستان ہے، دراصل ایک غلط یا خود فریب نظریہ ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتا ہے کہ وہ عظیم انسان جنہیں ہم ہیروز کہتے ہیں، یہ دعویٰ ضرور کرتے ہیں کہ وہ اس قابل ہیں کہ تمام ذمہ داریوں کو نبھا سکتے ہیں مگر ان میں اتنی سمجھ اور عقل نہیں ہوتی ہے کہ وہ اپنی بے وقعتی کو تسلیم کر لیں اور یہ بھی تسلیم کر لیں کہ بڑا آدمی، فرد یا ہیرو اس جانور کی طرح ہوتا ہے جسے ذبح کرنے یا قربانی کے لیے فربہ کیا جاتا ہے۔ اس کے گلے میں جو گھنٹی ہوتی ہے اس کے بجنے سے وہ یہ سمجھتا ہے کہ پورا ریوڑ اس کی آواز پر حرکت کر رہا ہے اور وہ ان کا راہنما ہے۔ مگر اس کا کردار راہنمائی یا لیڈری کا نہیں ہوتا بلکہ قربانی کا بکرا ہوتا ہے۔ مگر یہ ہیروز یا عظیم انسان اس راز کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتے ہیں۔ آخر میں قربان گاہ تک پہنچ کر وہ خود کو مجبور اور اپاہج پاتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب وقت گزر چکا ہوتا ہے اور کوئی ان کی مدد کو نہیں آتا ہے۔

## ب۔ فکشن میں ہیرو کا تصور

دنیا کے تمام ممالک میں جو فکشن تحریر ہوتا ہے اس میں ہیرو کا کردار نہ صرف ناگزیر ہے بلکہ اسے

مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ فنی نقطہ نظر سے ہیرو کے گرد تمام واقعات گھومتے ہیں۔ یہ کردار ہر معاملے میں فعال ہوتا ہے۔ بہادری، جرات و بے باکی، مقصد سے شدید لگاؤ اور اصلاحِ معاشرہ جیسی خصوصیات سے متصف یہ کردار ہمہ جہت شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن فکشن کے تمام ہیرو ایک جیسے نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ فکشن ہیرو کی ایک مثالی تعریف ممکن نہیں۔ فکشن میں ہیرو ہمیشہ خوبی اور بلندی کی علامت نہیں ہوتا بلکہ جدید فکشن ہیرو بالکل اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔یعنی ایسا ہیرو جس میں ظاہری بہادری کی خوبیاں نہ ہوں ایک عام شخص جو غیر معمولی حالات میں اپنی پوری کوشش کر رہا ہو۔ناقدین ادب نے ادبی ہیرو کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

i۔ کلاسیکی ہیرو(The Classical Hero)

کلاسیکی ہیرو ایک دیرینہ ادبی تصور ہے۔ اس کا آغاز یونانی ادب سے ہوا۔ یہ ہیرو ہمیشہ اچھے راستے پر گامزن رہتے ہیں اور صحیح کام کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ یہ ہیرو جلال و جمال کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ ہمت، طاقت، بہادری، شرافت، ایثار، حکمت غرض تمام انسانی خوبیاں ان میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ جنہیں وہ اپنی ریاضت اور جہد مسلسل سے درجہ کمال تک لے جاتا ہے۔ یہ ہیرو مافوق الفطرت صلاحیتوں کا مالک بھی ہو سکتا ہے کیونکہ کبھی بھی کسی مہم یا مسئلے کے حل کرنے میں ناکام نہیں ہوتے۔ فکشن میں کلاسیکی ہیرو تقریباً نا ممکن حد تک کاملیت کے درجے پر فائز ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ انسانوں کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔ ایک بلاگ کے مطابق:

> "کلاسیکی ہیرو ادب میں سب سے عام قسم ہے۔ یہ ہیرو ایک خاص معیار کے حامل ہوتے ہیں جو انہیں ہجوم سے الگ کرتے ہیں۔ یہ بہت جلدی سیکھتے ہیں اور کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ یہ بے مثال ضابطہ اخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی سب سے اہم خصوصیت طاقت کو استعمال کرنے کی صلاحیت ہے"[6]

ii۔ رزمیہ / جنگی ہیرو(The Epic Hero)

اس نوع کے ہیرو بھی کلاسیکل ہیرو کی طرح غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل انسان ہیں۔ عام طور پر یہ پیدائشی طور پر عظیم صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ ناقابل یقین حد تک منکسر المزاج اور دوسروں کی مدد

کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں فلاحِ عامہ کا جذبہ اس حد تک ہوتا ہے کہ وہ بار بار دوسروں کی خاطر اپنی زندگی موت کے دہانے تک لے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ سفر اختیار کرتے ہیں اور ان کی صلاحیتیں سفری مہمات میں زیادہ خصوصیت سے ابھرتی ہیں۔ ایک ہیرو کا تصور سب سے پہلے رزمیہ شاعری میں پیش کیا گیا۔ ایسے ہیرو، ثقافت، اقدار اور عقائد کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کو اپنی طاقت بناتے ہیں۔ سفر کے دوران انہیں ناقابل یقین حد تک بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ جنہیں مات دینا ان کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ کثرت سے سفر ان ہیرو کا مرغوب مشغلہ ہے۔ سفری مہمات کے دوران بہت سے عظیم لوگوں سے ملتے ہیں جو انہیں حوصلہ دیتے ہیں۔ یونانی اور رومی افسانوں میں زیادہ تر انہیں ہیرو کو پیش کیا گیا ہے۔ جن میں کنگ آرتھر، بیوول اور سیگی فرائڈ اس کی مثالیں ہیں۔ جبکہ اردو ادب میں سندباد اور جدید فکشن میں ہیری پوٹر ایپک ہیرو کی مثال ہے۔

iii۔ اینٹی ہیرو(Anti Hero)

جدید فکشن میں اینٹی ہیرو، ہیرو کی سب سے مقبول شکل ہے۔ یہ نہ تو ولن ہے اور نہ ہی کلاسیکل ہیرو کی طرح پیدائشی نیک انسان بلکہ اس کے برعکس یہ ایک ایسا کردار ہے جو اپنے فہم اور شعوری کاوش سے منفی سے مثبت کی جانب گامزن ہوتا ہے۔ غلطی سے درستی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جو شخص انہیں ولن سے مختلف بناتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ بالآخر صحیح کام کرتے ہیں چاہے یہ خود غرضی کی وجہ سے ہو۔

ایسے ہیرو کے اندر حق و باطل کا معرکہ ہوتا رہتا ہے اور بالآخر یہ حق کی جانب پوری قوت سے آجاتے ہیں۔ ایسے ہیرو حقیقی انسانوں سے قریب ہونے کی وجہ سے قارئین اور ناظرین میں بے حد مقبول ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی کہانی کا مرکزی کردار ہی ہوتا ہے مگر جرات اور بہادری اور مثالی اخلاق سے عاری بھی ہو سکتے ہیں۔ اکثر یہ ہیرو مفادات سے فائدہ اٹھانے والے یا روایتی اخلاقی ضابطوں کی خلاف ورزی کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے کبھی کبھار یہ قابل نفرت بھی ہو جاتے ہیں۔

ڈان نیوز میں 2 جولائی 2014ء کو ماہ جبیں منکائی کا ایک کالم "پاکستان کی اینٹی ہیرو 'بلڈی نسرین' سے ملاقات کے نام سے شائع ہوا۔[7] جس میں مصنفہ نے شاہان زیدی کے ناول "بلڈی نسرین" میں نسرین کا کردار ادا کرنے والی نسرین کو اینٹی ہیرو قرار دیا۔ جو بظاہر ایک بد تمیز لڑکی ہے، انسانی ڈھانچے کے پرنٹ والی قمیص، چوڑی دار پاجامہ اور جوگرز پہنتی ہے۔ دوپٹہ نہیں اوڑھتی، تمباکو نوشی کرتی ہے اور اس کی جارحانہ فطرت سے ناظرین

تنگ پڑتے ہیں۔ مگر بد تمیز نظر آنے والی لڑکی نسرین ظالم نہیں ہے۔ وہ دہشت گردی، ہیومن ٹریفکنگ، کرپشن اور ظلم کے خلاف بر سرِ پیکار ہے۔ اسی طرح سعادت حسن منٹو کے افسانے کی مرکزی کردار 'موزیل' بھی اینٹی ہیرو ہے۔ اینٹی ہیرو کے بارے میں وجاہت مسعود اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

> "اینٹی ہیرو کسی ادبی فن فارے کا وہ مرکزی کردار ہوتا ہے جو ہیرو کی عمومی خصوصیات مثلاً بہادری، کردار کی بلندی اور فراست سے عاری ہوتا ہے۔ لیکن واقعات کی بھول بھلیوں میں الجھ کر، نادیدہ طاقتوں سے ٹکراتا اور بار بار رستہ بدلتا بالآخر وہاں جا پہنچا ہے جہاں ہیرو کی خوبیوں سے عاری ہونے کے باوجود وہی بیانیے کا ہیرو قرار پاتا ہے"۔[8]

iv۔ Everyman Hero

یہ ہیرو عام طرح کے لوگ ہیں، جو معمولی صلاحیتیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ مگر غیر معمولی حالات میں ان کی صلاحیتیں اس خوبی اور کمال سے سامنے آتی ہیں کہ یہ ہیرو کی طرح عمل کرتے ہیں۔ گویا غیر معمولی حالات ان سے ہیرو کی طرح کام کرواجاتے ہیں۔ ان کے ہاں کلاسیکل یا ایپک ہیرو کی سی صلاحیتیوں کا فقدان ہوتا ہے۔ گوگل کے ایک بلاگ کے مطابق:

> "They're underdogs who are thrown into extraordinary situations fortunately, their strong moral compass and selflessness help them get through the challengs no matter how ill-eqipped they are."[9]

کہانی یا فکشن کے سپر ہیرو سے ہمدردی کرنا مشکل ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک عام شخص سے قاری یا ناظر کا رشتہ بہت جلد اور مضبوطی سے استوار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہیرو بہت جلد مقبول بھی ہوتے ہیں اور قاری سے اپنا ناطہ بھی استوار کر لیتے ہیں۔ اس کی مثال مولوی عبد الحق کا لکھا ہوا خاکہ نام دیو مالی ہو سکتا ہے۔ نام دیو بالکل ایک عام سا انسان ہے۔ پیشے کے اعتبار سے مالی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی کام اور پیشے سے اس کی لگن ہے۔ وہ باغ کی انتھک محنت اور محبت سے باغبانی کرتا ہے۔ ایک سال قحط پڑا سوائے نام دیو کے باغ کے سارے پودے پیڑ اپنی تازگی کھو بیٹھے اور ایک دن نام دیو اپنے کام میں اس قدر مگن تھا کہ اسے خبر نہ ہوئی کہ شہد کی

مکھیوں نے یورش کر دی، اسے اتنا کاٹا کہ اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔

v۔ المیہ ہیرو(Tragic Hero)

المیہ ڈراموں میں مرکزی کردار المیہ ہیرو کہلاتا ہے۔ المیہ ہیروز میں عام طور پر بہادری اور جرات کے تمام تر خصائص ہوتے ہیں۔ جس کے باعث یہ سامعین یا قارئین کی ہمدردی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ان میں چند خامیاں یا کمزوریاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ان کے زوال کا باعث بنتی ہیں۔ شیکسپئر کے "رومیو اینڈ جولیٹ" میں رومیو ایک المیہ ہیرو ہے۔ محبت میں اس کا لاپرواہ جذبہ جو اسے ایک مجبور کردار بناتا ہے براہ راست اسے موت کی طرف لے جاتا ہے۔

المیہ ہیرو کے تصور کے بارے میں سب سے پہلے یونانی مفکر ارسطو نے لکھا۔ اس کا ماننا تھا کہ ایک کامیاب المیہ ڈراما وہی ہے جو ہمدردی اور خوف کے جذبات ابھارے۔ لہٰذا اس نے المیہ کے ہیرو کی یہ خصوصیات لازمی قرار دیں۔ ارسطو کے مطابق خوف اور ترحم یا ہمدردی کیتھارسس کے لیے بنیادی حیثیت کے حامل ہیں، ارسطو کہتا ہے:

> "Pity to aroused by unmerited misfortune, fear by misfortune of a man like ourselves".[10]

ارسطو کے مطابق ایک المیہ ہیرو کے لیے ضروری ہے کہ وہ

- نیک ہو۔(Be virtuous)
- اس میں کوئی خامی ہو(ہمارشیا)۔(Be Flawed)
- اس کا تعلق کسی شاہی خاندان یا بڑے گھرانے سے ہو۔

ارسطو کے زمانے میں Virtuous ہونے کا مطلب یہ تھا کہ کردار نیک ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر، قابل اور طاقتور ہو۔ اسے یونانی ثقافت اور عزت و اخلاق کا علمبردار بھی ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہیرو کی یہ خصلت اسے سب سے زیادہ پرکشش بناتی ہے۔ اسی طرح بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ کردار میں ایک المناک خامی کا ہونا بھی ارسطو کے نزدیک المیہ ہیرو کے لیے ضروری ہے اور یہ خامی ہی اس ہیرو کے زوال کا باعث بنتی ہو۔ یہ خامی کسی بھی المیہ ڈرامے کو کامیاب، طاقتور اور دیرپا اثر کرنے والا بناتی ہے۔ گویا المیہ ہیرو کی قسمت کسی المناک خامی یا

غلطی کی وجہ سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ جو بالآخر ہیرو کے خوفناک انجام کو جنم دیتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ المیہ ہیرو کے تصور میں تبدیلی آئی ہے۔ پہلی تو یہ ہے کہ

- المیہ ہیرو کسی خاص پس منظر یعنی شاہی خاندان کا بڑے خاندان کے علاوہ کوئی عام گھرانے کا شخص بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ضروری نہیں کہ وہ مرد ہو، یہ عورت بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ نوبل (نیک) ہو۔ وہ ایک ایسا عام آدمی بھی ہو سکتا ہے جو خامیاں بھی رکھتا ہے۔ البتہ دو خصوصیات جو کسی المیہ ہیرو کے لیے ضروری ہیں وہ یہ ہیں کہ:
- المیہ ہیرو کو سامعین کی ہمدردی حاصل ہو۔
- المیہ ہیرو کو اپنی بہترین کوششوں کے باوجود اپنے کردار میں موجود کسی خامی کی وجہ سے برباد ہونا پڑے۔

**vi۔** بائرونک ہیرو (Byronic Hero)

انیسویں صدی میں انگریزی رومانوی شاعر لارڈ بائرن نے ہیرو کا تصور پیش کیا جسے بائرونک ہیرو کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی تعریف ایک ایسے کردار کے طور پر کی جاتی ہے جو مرکزی اور کلیدی ہوتا ہے، جو روایتی سماجی اقدار کو مسترد کرتا ہے۔ اسے رومانٹک ہیرو کا Variant قسم بھی کہا جاتا ہے۔ مورخ اور نقاد لارڈ میکالے کے الفاظ میں یہ کردار "ایک مفرور، موڈی، خبطی، پیشانی پر شکوک کی شکنیں رکھنے والا، دل میں غم رکھنے والا، طعنہ دینے والا، پھر بھی گہرے پیار کے قابل"[11] ہوتا ہے۔

بائرونک ہیرو فکشن کا ایسا کردار ہے جس کا ماضی میں کوئی نہ کوئی گہر صدمہ یا کوئی راز چھپا ہوتا ہے جس کے باعث اس کی نفسیاتی کیفیت متعین ہوتی ہے۔ بہت سے ناقدین کا خیال ہے کہ لارڈ بائرن نے دراصل خود کو اپنی کہانیوں اور نظموں میں بطور بائرونک ہیرو پیش کیا ہے۔

**vii۔** سپر ہیرو (Super Hero)

سپر ہیرو فکشن کا ایک ایسا کردار ہے۔ جو غیر معمولی انسانی طاقتوں کا مالک ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق سپر ہیرو کی تعریف یہ ہے:

"A Character in a story, movie etc, who has unusual strength

or power and uses it to help people, a real person who has done something unusually brave to help someone opposite superllian."[12]

سپر ہیرو میں ایسی صلاحیتیں ہوتی ہیں جو انہیں مافوق الفطرت بناتی ہیں۔ وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس دنیا کو بہتر سے بہتر جگہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بے گناہوں اور کمزوروں کی حفاظت کے لیے خود کو وقف کیے رکھتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اکثر بھیس بدل کر ایک اور شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس کی سب سے مشہور مثال سپر مین ہے۔ اس کی غیر معمولی جسمانی ساخت اسے اُڑنے اور دوسروں کو شکست دینے کی صلاحیت بخشتی ہے۔

viii۔ رومانوی ہیرو(Romantic Hero)

رومانوی ہیرو کا نام کسی ایسے ہیرو کی طرف اشارہ نہیں کرتا جس کے رومانوی تعلقات ہیں یا وہ حسن و عشق کا دلدادہ ہو۔ اس کی بجائے رومانوی ہیرو دراصل ادب کے رومانوی دور سے منسوب ہے۔ رومانوی ہیرو کی واضح خصوصیات ان کا پہلے سے قائم کردہ اصولوں کو مسترد کرنا اور حد سے بڑھا ہوا احساس ذات ہے۔ یہ ہیرو اپنی ذات کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اپنی "اتھارٹی" خود بناتے ہیں اور اپنے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کے قائل ہوتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ رومانوی ہیرو منفی خیالات کے حامل ہوتے ہیں یا ان میں کرداری خامیاں ہوں۔ اس کے برعکس یہ ہیرو معاشرتی توقعات کے مطابق نہیں ہوتے۔ فخر اور اعتماد ذات انہیں اپنی اہمیت کا مسلسل احساس دلائے رکھتا ہے۔ یہ دنیا کو اپنے منفرد انداز سے دیکھتے ہیں اور خود کو الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ وہ معاشرتی اصولوں کو بلا جھجھک توڑ سکتے ہیں اور زندگی کے سانچے بنانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم رومانوی ہیرو کو کلاسیکل ہیرو کے برعکس کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ شدید جذباتیت، آزادی کی خواہش، باغیانہ شعور، حسن پرستی، رومانٹک ہیرو کی خصوصیات ہیں۔

مندرجہ بالا ہیرو کی خصوصیات عام طور پر فکشن میں زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔ اگرچہ کچھ ناقدین نے ان اقسام کے علاوہ بھی فکشن کے ہیرو پر بات کی ہے مگر یہ ہیرو یا تو بیان کیے گئے ہیرو کا varient ہیں یا اسی طرح کی خصوصیات کے مالک ہیں۔ گویا فکشن کا ہیرو دراصل فکشن نگار کا ایک ایسا کردار ہوتا ہے جس کے توسط سے وہ اپنے

نظریات متعارف کرواتا ہے۔ مگر ضروری ہے کہ اس ہیرو کے ساتھ قارئین اور ناظرین اپنا ایک رشتہ استوار کر سکیں کیونکہ اگر فکشن نگار ایسا نہیں کر پاتا تو وہ ایک مقبول اور کامیاب ہیرو کا تصور پیش نہیں کر پاتا تو وہ ایک مقبول اور کامیاب ہیرو کا تصور پیش کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ فکشن کا ہیرو کسی ایک تعریف پر پورا نہیں اترتا اور نہ ہی کوئی ایک ایسا سانچا ہے جس میں اسے فٹ کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ فکشن نگار جس نظریے یا مقصد یا اثر پذیری کے تحت لکھتا ہے اسی نظریے کو فروغ دینے کے لیے اسے ہیرو تراشنا ہوتا ہے۔

جبکہ تاریخی ہیرو کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ تاریخ کے ہیرو کی جڑیں افسانوی فضا میں نہیں بلکہ تاریخ کے کسی دور میں پیوست ہوتی ہیں۔ اسے اپنی تشکیل اور نمو کے لیے کسی تاریخی دور کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر یہ بھی اہم ہے کہ تاریخ نے ہیرو کے طور پر مانا ہے! یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہیرو کی پیشکش عام طور پر محدود ہوتی ہے۔ یہ ہیرو کسی شعبہ حیات میں بہت نمایاں ہوتا ہے۔ انتہائی با اثر اور طاقت ور ہوتے ہیں۔ یہ ہیرو اپنی فطری صفات کی وجہ سے جیسا کہ غیر معمولی بہادری، شجاعت و جرات، عقل مندی اور بے مثال قائدانہ صلاحیتوں کے باعث فیصلہ کن تاریخی اثر رکھتے ہیں۔ تھامس کارلائل کے مطابق تاریخی ہیرو مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ الوہی ہیرو

2۔ پیغمبر ہیرو

3۔ ادبی ہیرو

4۔ شاعر ہیرو

5۔ مذہبی پیشوا (پریسٹ) ہیرو

6۔ بادشاہ ہیرو[13]

فی زمانہ اس میں سائنس، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور دیگر جدید شعبوں کے عظیم انسانوں کا اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ تاریخی فکشن چوں کہ تاریخ اور فکشن دونوں سے مواد لیتا ہے۔ لہٰذا تاریخی فکشن کے ہیرو کی مثال ایک ایسے عظیم انسان سے دی جا سکتی ہے۔ جو انسان اور دیوتا کے ملاپ سے پیدا ہوا ہو۔ یوں اس میں حقیقت اور افسانہ، انسان اور دیوتا فطرت اور مافوق الفطرت غیر معمولی مرکب صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ عظیم المثال امتزاج اور وسعت جہاں اور تاریخی فکشن نگار کے لیے امکانات کا ایک جہاں پیدا کرتی ہے وہیں اس کے لیے کچھ

پابندیاں اور ضوابط بھی لاگو کرتی ہے۔ تاریخی فکشن کا ہیرو تاریخی تو ہوتا ہے مگر اس کے اوصاف افسانوی ہو سکتے ہیں۔ تاریخ کے بطن سے پیدا ہونے والا ہیرو جب فکشن کی محبت میں جوان ہوتا ہے تو وہ دونوں کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادیت کو بھی برقرار رکھتا ہے۔

فکشن کے ہیرو پر تاریخی ہیرو اور فکشن ہیرو دونوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ گو Greatman کا زعم اس کے کردار کو مثالیت کے درجے پر فائز کرتا ہے مگر وہ شعر فہم، حسن پسند، خوش گفتار، مہربان و مددگار اور باذوق بھی ہے۔ڈاکٹر خورشید احمد گوریجہ لکھتے ہیں:

> "عام ناول نگار اپنے گردو پیش کے زمانے، تہذیب و تمدن اور انسانوں سے کہانی کا خمیر اٹھاتا ہے۔ جبکہ تاریخی ناول نگار کو کسی گئے گزرے زمانے کے گرد آلود ماحول، تہذیب و تمدن اور کرداروں کی بنیادوں پر کہانی کا قصہ استوار کرنا ہوتا ہے۔ تاریخی ناول نگار اگر ذرا بھی کوتاہی کرے یا کہانی کے انتخاب میں سستی کا مظاہرہ کرے تو اس کا راز طشت از بام ہو جائے گا۔۔۔ تاریخی ناولوں میں عموماً دوہری کہانی ہوتی ہے۔ایک کہانی تاریخی واقعات اور کرداروں پر مشتمل ہوتی ہے دوسری کہانی فرضی کرداروں اور واقعات پر مشتمل ہوتی ہے یہ مساوی طور پر ایک سمت میں سفر کرتی رہتی ہیں۔ لیکن کسی نہ کسی جگہ دونوں کے سرے آپس میں مل جاتے ہیں"۔[14]

## ج۔ تاریخی فکشن میں ہیرو کا کردار: تشکیلی عناصر کا تجزیہ

تاریخی فکشن کی بنیادیں تاریخ کے کسی دور یا واقعہ میں پیوست ہوتی ہیں۔ یہ نہ تو محض فکشن میں تخیل کی افتراپردازی ہے اور نہ ہی واقعات تاریخ کا مجموعہ۔ تاریخی فکشن بیک وقت ان دونوں یعنی فکشن اور تاریخ سے نمو پاتا ہے۔ تاریخ اور تخیل دونوں اس کے لیے مواد اکٹھا کرتے ہیں۔ واقعات کا بیان تاریخ اور فکشن دونوں کے لیے اہم ہوتا ہے۔ تاریخی فکشن کا ہیرو اپنی کرداری صفات میں تاریخی شخصیات اور تخلیقی ادب کے ہیرو کا مرکب ہوتا ہے۔ سابقہ موضوعات میں ہم نے دیکھا کہ ہیرو کے تصور میں جدید زمانے تک کچھ تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں لیکن ہیرو کی تشکیل میں چاہے وہ تاریخی فکشن کا ہیرو ہو یا فکشن کا ہیرو، طاقت ور تخیل کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ سب

سے پہلی بات تو تاریخی فکشن کے ہیرو اور عام فکشن کے ہیرو میں ایک فرق قائم کرتی ہے وہ ہے تاریخی فکشن کے ہیرو کا کسی نصب العین، کسی نظریے، مقصد یا مشن سے متعلق ہونا۔ اس کی زندگی اپنی ذات کی بجائے اس کی نظریے کی تابع ہوتی ہے۔ یہ نظریہ اس کے مذہب کی دین بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی روایت کا حصہ بھی ہو سکتا ہے اور اس کی قوم کا نصب العین بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے اردو تاریخی ڈرامے کی روایت کے مطالعے کے دوران دیکھا کہ تاریخی ڈرامے کا ہیرو اپنے نصب العین پر کسی اور چیز کو فوقیت نہیں دیتا۔ تاریخی ڈراموں کے ہیرو کی جو خوبی ہماری توجہ کو اپنی جانب مبذول کرواتی ہے وہ ان کا ذاتی کردار یا ان کی جنگیں نہیں بلکہ ان کے نظریات ہیں جو فکشن نگار ان کے مکالموں کی صورت میں ان کے منہ سے کہلواتا ہے۔ مذہب پسند ہیرو اپنے دین اور خالق کی خوشنودی کی خاطر جہاد کرتا اور دشمنوں بالخصوص کفار کے خلاف نبرد آزما نظر آتا ہے۔ وہ توحید کا علمبردار ہے اور اسلام کے سنہری اصولوں کی ترویج اور فروغ اس کا نصب العین ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ جہاد کا راستہ اپناتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ تاریخی فکشن کا مصنف اپنے ہیرو کو محض نظریاتی ہیرو کے طور پر پیش نہیں کرتا بلکہ اسے شاعرانہ ذوق اور فلسفیانہ مزاج کا حامل بھی بناتا ہے۔ "شاہین" "ٹیپو سلطان" "بہادر شاہ ظفر" "جلال الدین خلجی" اور "نواب سراج الدولہ" پی ٹی وی کے ایسے تاریخی ڈرامے ہیں جہاں ہیرو ہمیں دشمن قوتوں کے خلاف انتہائی نامساعد حالات میں کھڑا نظر آتا ہے۔ اور اپنے نظریے اور نصب العین سے سرِ مو انحراف نہیں کرتا۔

شاہانہ ہیرو:

اردو تاریخی ڈراموں کی روایت کے اجمالی جائزے سے یہ نتیجہ نکلا کہ عام طور پر تاریخی ڈراموں کا ہیرو کوئی عام یا غیر معروف شخصیت نہیں ہوتا۔ وہ کوئی فرماں رواں، عظیم الشان شخصیت، شہزادہ، مفکر، دانشور، رئیس یا پھر اعلیٰ مرتبہ کا حامل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم قریشی کے مطابق یہ ہیرو بادشاہ یا شہزادہ نہیں تو ریاست کا قائد یا کم از کم اعلیٰ خاندان کا فرد ہوتا ہے۔ جس کے باعث عام لوگوں کی دلچسپی اس کے کردار میں بڑھ جاتی ہے۔ وہ ارسطو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "ڈراما تحقیق کے ابتدائی مراحل میں ارسطو کے یہ الفاظ کہ ہیرو کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ شخص نام ور اور بڑا خوش حال ہو، ہماری نظر سے گزرتے ہیں"۔[15]

بہادری اور جرات مندی:

بہادری اور جرات مندی تاریخی ڈراموں کے ہیرو کی ایسی صفت ہے جو نہ صرف بنیادی ہے بلکہ اس کے باعث یہ باقی تمام کرداروں اور واقعات پر حاوی ہو جاتا ہے۔ یہ بہادری بالخصوص اس وقت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جب حالات نا مساعد اور سنگین تر ہو جاتے ہیں۔ یہ بہادری اسے ایسی جرات عطا کرتی ہے کہ وہ بڑے بڑے فرعونوں کے سامنے کلمہ حق کہنے میں جھجکتا نہیں ہے۔ 1980 میں پی ٹی وی سے نشر ہونے والا ڈراما "شاہین" جس کا ہیرو بدر بن مغیرہ ہے۔ جو محض چند سپاہیوں کے ساتھ فرڈینینڈ کو شکست دینے کا عزم کر چکا ہے۔ اور وہ کئی محاذوں پر ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس کے پیچھے اس کی عسکری قوت نہیں بلکہ جرات، بہادری اور اعتماد ذات ہے۔ اس کا اظہار اس کے قریبی ساتھی کی تقریر میں اس وقت ہوتا ہے جب بدر بن مغیرہ غرناطہ آتا ہے:

> "موسیٰ نے تقریر شروع کی:
> غرناطہ کے لوگو! آج تمہارے درمیان وہ اولوالعزم مجاہد کھڑا ہے جس نے اندلس کی تاریخ میں اپنا نام نوکِ شمشیر سے لکھا ہے۔ جس نے مٹھی بھر مجاہدین کے ساتھ کئی بار فرڈینینڈ کی ٹڈی دل فوج کو شکست دی۔ بدر بن مغیرہ "تمہارا سرحدی عقاب" تمہارے لیے ایک پیغام لے کر آیا ہے اور وہ پیغام یہ ہے کہ وہ جماعت جو اپنی عزت اور آزادی کے لیے خون میں نہانے اور آگ میں کودنے کے لیے تیار ہو اور دنیا کی کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی"۔[16]

## حکمت و دانائی:

تاریخی فکشن کا ہیرو جہاں بہادر، جرات مند اور باوقار ہوتا ہے وہیں اس کی خاص خوبی "حکمت و دانائی" ہے۔ وہ محض جماعت یا نصب العین کے تابع نہیں ہوتا بلکہ قوت تدبیر سے کام لیتے ہوئے اپنے مقاصد کی تکمیل کی طرف بڑھتا ہے۔ تاریخ کے نامور افراد ہوں یا فکشن کے بنیادی کردار دونوں میں اس صلاحیت کی موجودگی ہی انہیں ہیرو بناتی ہے۔ حقیقی تاریخی شخصیت کو ہیرو بناتے وقت فکشن نگار کو ازحد احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے میں ایک تو ناظرین پہلے سے اس شخصت سے متعارف ہوتے ہیں اور زیادہ قرآن کے معترف بھی۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی کردار کو اگر زرہ سی بے احتیاطی سے پیش کیا جائے تو ڈراما کمزور ہو جاتا ہے لیکن اگر غیر معروف

تاریخی شخصیت کو ہیرو کے طور پر دکھایا جائے تو ایسی صورت میں اس کی شخصیت سازی کے تانے بانے مصنف کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ لہذا مصنف اپنے ہیرو کو بہادری اور فیاضی، حکمت اور ذہانت اور دوسرے اخلاقی معاملات میں ایک مثال کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یوں تاریخی فکشن کا ہیرو عام انسانوں میں رہتے ہوئے بھی خاص الخاص بن جاتا ہے۔ وہ اپنی بہادری اور شجاعت کے ساتھ ساتھ اپنی ذہانت سے بھی بہت سے مسائل پر قابو پا لیتا ہے۔

چونکہ پوری کہانی ہیرو کے گرد گھومتی ہے اور اس کردار کی کمزوری پورے ڈرامے کی کمزوری بن جاتی ہے لہذا مضبوط، بہادر، دلیر ذہین اور اخلاقِ حسنہ سے متصف ہیرو ہی تاریخی فکشن میں قابل قبول ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ صرف ہیرو نہیں بلکہ لیڈر بھی ہوتا ہے وہ اپنے قبیلے یا قوم کا پیشوا بھی ہوتا ہے۔ لہذا وہ یہ کردار مصنف کے زور تخیل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> "تاریخ میں کردار اور واقعات دونوں حقیقی ہوتے ہیں اور مورخ کو پیش کرنے میں اپنی شخصیت کردار اور فیصلہ شامل کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا کام کیمرے کی طرح اصل کی ایک ایسی نقل اتارنا ہے جو اصل سے سر مو انحراف نہ کرے۔ ناول میں خصوصاً تاریخی ناول میں نام چاہے حقیقی ہوں، داستان، معاملات مناظر سب ناول نگار کے تخیل کی پیداوار ہوتے ہیں اور حقیقت سے ان کا تعلق برائے نام ہی ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں اس کی نقل نہیں ایجاد اور تخلیق پر زور ہوتا ہے"۔[17]

گویا تاریخی فکشن کا مصنف اپنے ہیرو کے لیے واقعاتی مواد تو تاریخ سے لیتا ہے مگر کردار کا مواد اپنے تصور سے خلق کرتا ہے۔

کردار نگاری بلاشبہ ایک مشکل عمل ہے مگر اس سے بھی زیادہ تاریخی فکشن میں ہیرو کے کردار کی تخلیق و تشکیل ہے اگر یہ کردار مضبوط ہو تو پوری کہانی جمی رہتی ہے بصورتِ دیگر پوری کہانی کمزور ہو جاتی ہے۔ ہیرو کا کردار تمام کرداروں میں منفرد ہونا چاہیے اور ساتھ ہی دلچسپ کہ فوق البشر جیسی خصوصیات کے باوجود وہ ایک انسان ہی تھے۔

## د۔ تاریخی فکشن میں ہیرو کا کردار: مثالی اور ٹائپ کردار کے تناظر میں

قوموں کے لیے تاریخ نہ صرف ماضی کا حوالہ ہے بلکہ یہ مستقبل کا آئینہ اور قیمتی سرمایہ بھی ہوتی ہے۔ تاریخی فکشن اس سرمایے کو تحفظ اور فروغ دینے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ کسی بھی فکشن میں کرداروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ہیرو بلاشبہ کسی بھی کہانی کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔ اہمیت کے ساتھ ساتھ مقبولیت کے لحاظ سے بھی یہ نمایاں ترین کردار ہوتا ہے۔ تاریخی تناظر میں کردار کی تشکیل اور پھر اسے ہیرو کی صورت میں پیش کرنا ایک فنی ریاضت اور تاریخ پر گہری نظر کا متقاضی ہے۔ فکشن میں مختلف کرداروں کی اہمیت اپنی جگہ مگر "ہیرو" مرکزِ نگاہ ہونے کے باعث اہمیت میں سرِفہرست ہے۔ سید عابد علی عابد نے کرداروں کی اقسام کے حوالے سے لکھا ہے:

> "کردار اصلاً دو اقسام کے ہوتے ہیں ایک ٹائپ یا جامد دوسرے ڈرامائی یا متحرک، جو کردار ٹائپ ہوتے ہیں وہ کسی طبقے، گروہ یا کسی معاشرتی جماعت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی سیرت ماہ و سال کے ڈھانچوں میں ڈھل کر پختہ ہو جاتی ہے اور ان کا کردار اس اعتبار سے جامد ہوتا ہے کہ زندگی کے بدلتے ہوئے متغیرات ان کا ساتھ نہیں دیتے"۔[18]

اگرچہ ٹائپ کردار کے بارے میں عام طور پر ناقدین کی یہی رائے ہوتی ہے کہ وہ بنے بنائے کردار ہوتے ہیں، ان میں تبدیلی یا کوئی ڈرامائی موڑ جنم نہیں لیتا جس کے باعث یہ کردار عام طور پر مردہ کردار سمجھے جاتے ہیں۔ ٹائپ یعنی آرکی ٹائپ جسے اردو میں نخست مثال کہا جاتا ہے۔ نخست فارسی کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں "اولین" نخست مثال سے مراد یہ ہے کہ کسی ماورائی یا الوہی سطح پر ہر دیناوی چیز کے بنیادی سانچے موجود ہیں۔ دنیا کی ہر چیز انہیں سانچوں کی نقلیں ہیں۔ حیاتِ انسانی کے بنیادی پہلو نخست مثالی خصوصیات رکھتے ہیں جیسے پیدائش، شادی، عائلی اور سماجی زندگی موت، والدین، بچوں کے درمیان رقابت وغیرہ۔ بعض کردار بھی آرکی ٹائپ پیرایہ اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً مجنوں کو عشق سے نسبت ہے اور چنگیز خان کو ظلم و ستم سے۔

بنیادی طور پر اصطلاح علم البشریات (Anthropology) سے ادب میں آئی ہے۔ یونگ نے اسے اجتماعی لاشعور کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ آرکی ٹائپ وہ قدیم الاصل وضعیں ہیں جو ابتدائی تمثالوں کی شکل میں نسلِ انسانی میں آگے سے آگے منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔ تاریخی طور پر پرانے قصے اور کہانیوں میں موجود

اولین نقوش اور تمثالیں جو ورثے کے طور پر فرد کے لاشعور میں محفوظ ہوتے ہیں آر کی ٹائپ کہلاتی ہیں۔ ژونگ کے خیال میں: "عقلی شعور کی سربفلک عمارت کی نچلی منزلوں میں پوری نسلِ انسانی کا ماضی تمثالوں کی شکل میں موجود ہے وہی اجتماعی شعور آر کی ٹائپ ہے۔"[19]

کم و بیش اسی طرح کی تعریف آلڈس ہکسلے نے آر کی ٹائپ کی توضیح میں لکھی ہے:

> "اجتماعی لاشعور کا مواد ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی ہوتا ہے۔ یعنی یہ کسی فرد واحد سے مخصوص نہیں بلکہ کم از کم کسی ایک گروہ بلکہ اصولی طور سے تو کسی ایک قوم اور بالآخر تمام انسانیت پر حاوی ہوتا ہے۔ اجتماعی لاشعور کا مواد فرد اپنی زندگی کے دوران حاصل نہیں کرتا بلکہ یہ تو ورثے میں ملے ہوئے جبلتی سانچے ہیں۔ تفہیم کی اساسی صورتیں اور بنیادی علامات انھیں کو اصطلاح میں آر کی ٹائپ کہا جاتا ہے۔"[20]

محمد ہادی حسین نے "مغربی شعریات" کے آخر میں جو فرہنگ مصطلحات دی ہے۔ اس میں آر کی ٹائپ کا ترجمہ امہات النقوش اور امہات الصور کیا ہے۔ ابوا لاعجاز حفیظ صدیقی کے مطابق بہتر ترجمہ "قدیم الاصل اوصناع" ہے جو انہی کے قلم سے نکلا ہے اور اس کتاب کے متن میں کئی مقامات پر نظر آتا ہے۔

گویا آر کی ٹائپس کسی فرد کے لاشعور کا وہ حصہ ہے جس میں نسلِ انسانی کے تجربات وراثتاً محفوظ ہوتے ہیں لاشعور کا انکشاف سگمنڈ فرائیڈ نے کیا تھا۔ جبکہ لاشعور ژونگ کی دریافت ہے۔ ڈبلیو۔ بی۔ بیٹس بھی ایک عظیم حافظہ کے نظریے کا پیش کار تھا۔ اس کے مطابق فرد کے حافظہ عظیم میں ازلی اور ابدی تمثالیں محفوظ رہتی ہیں اور وقتاً فوقتاً منعہ شہود پر آکر ہمیں یہ توفیق بخشتی ہیں کہ ہم حقیقت کے قدیم اور اصل منبع سے اپنی روح کی پیاس بجھا سکیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر اپنی تصنیف "مغرب میں نفسیاتی تنقید" میں لکھتے ہیں کہ آر کی ٹائپ یونانی زبان کا لفظ ہے اور اس سے مراد وہ اصل سانچہ تھا یا ماڈل تھا جس کے مطابق دوسری اشیا بنائی جاتی تھیں۔[21]

فکشن کے ہیرو کو اگر ہم ٹائپ کے تناظر میں دیکھیں تو ہمیں اس میں کچھ خصوصیات واضح طور پر وہی نظر آتی ہیں جو ہمارے اجتماعی لاشور کی صورت ہمیں توارث ہوئی ہیں۔ فطرتِ انسانی ہے کہ وہ زندگی حقائق اور افسانے کے بین بین گزارتا ہے۔ اسے حقیقت کی دنیا میں اگرچہ مستقل قیام کرنا ہوتا ہے مگر کبھی کبھار وہ اپنے

خوابوں کی سرزمین میں بھی جاتا ہے۔ حقیقی دنیا میں جو محرومیاں رہ جاتی ہیں وہ خوابوں کی دنیا میں حاصل کر کے خوشی پاتا ہے۔ ٹائپ کرداروں کی تحقیق میں جہاں فکشن نگار اپنے تخیل کو حقیقت سے قریب تر کرنے کی کوشش کرتا ہے وہیں ایسے کرداروں کو بطور مثال پیش کرنے کی بھی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ آرکی ٹائپ اور مثالیت پسندی عام طور پر ہیرو کے کردار میں اس طرح جھلک رہی ہوتی ہے کہ اگرچہ ہیرو کوئی دیوتا تو نہیں ہوتا مگر انسانی خوبیاں بدرجہ اتم اس میں موجود ہوتی ہیں۔ یوں فکشن نگار ایک ایسا مثالی ہیرو ترتیب دیتا ہے جو اگرچہ اس دنیا میں موجود تو نہیں ہوتا مگر اس کا وجود ہمارے فکر و نظر کے لیے باعثِ تسکین ہوتا ہے۔ ایک عظیم انسان کسی حد تک مثالی یا آئیڈیل ہو سکتا ہے، فکشن نگار ہیرو کے کردار میں یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے یوں ہیرو کے کردار کی عظمت میں مبالغہ آمیزی ناظرین کو بھاتی ہے اور وہ اسے سراہتے ہیں۔ ہیرو کی حد سے بڑھی خصوصیات دراصل ہیرو کو کیسا ہونا چاہیے کی تشریح کر رہی ہوتی ہیں۔ لہٰذا عام طور پر ہیرو کے کردار کی عظمت کی بلندیاں سوال کو جنم دینے کی بجائے لطف کا سامان بنتی ہیں۔ ہیرو کی بے پناہ بہادری ہیروئن کا پریوں جیسا حسن، ولن کی حد سے بڑھی ہوئی سفاکی اور درندگی یہ سب دراصل ہمارے مثالی کرداروں کی غماز ہوتی ہے۔ ادب میں زندگی کو اس طرح پیش کرنے کی بجائے جیسی کہ وہ ہے اسی طرح پیش کرنا جیسے کہ اسے ہونا چاہیے۔ مثالیت یا عینیت کہلاتا ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے (Idealism) کی اصطلاح مستعمل ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> "یہ ایک طرف کلاسیکیت کی ضد ہے اور دوسری طرف حقیقت نگاری کے مسلک کی ضد۔۔۔ ادب کا یہ مسلک مثالی حقیقتوں میں یقین رکھتا ہے، جو ہے اس کو ناکافی اور مکمل سمجھتا ہے، روحانی، وجدانی اور اخلاقی نصب العین پر خاص زور دیتا ہے"۔[22]

مثالیت پسندی بنیادی طور پر تنقید کی اصطلاح ہے۔ زندگی کو اس طرح پیش کرنا جیسی کہ اسے ہونا چاہیے۔ یہ انداز تخلیق رومانویت کا خاصا ہے۔ اور کلاسیکیت کی ضد ہے۔ مثالیت یا عینیت میں اعتدال اور ضبط و توازن سے کام لیا جاتا ہے۔ آئیڈیلسٹ ادب "جو ہے" کی بجائے "جو ہونا چاہیے" کو اہمیت دے کر زندگی کے نصب العینی معیارات پر یقین رکھتے ہیں۔ گویا یہ مسلکِ ادب "Is" کی بجائے "Must be" کے خواب دیکھتا ہے۔ روحانی اور اخلاقی نصب العین پر زور دینا اور موجود پر عدم اطمینان عینیت یا مثالیت کا شیوہ ہے۔

مثالی اور ٹائپ کردار کے تناظر میں تاریخی فکشن کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ تاریخی

فکشن نگار کو ہیرو کا کردار تخلیق کرتے ہوئے غیر تاریخی فکشن کی نسبت زیادہ احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ بعض تاریخی کردار تو ناظرین میں پہلے سے مقبول ہوتے ہیں جن کے بارے میں ذرہ سی غلطی ناول یا ڈرامے کی نامقبولیت کا باعث بن سکتی ہے۔ قاری تاریخی ہیرو کو Idealize کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو اچھے خصائص ایک بڑے انسان میں موجود ہو سکتے ہیں اس کا بدرجہ اتم اظہار ان کے "ہیرو" میں ہو۔ لہذا تاریخی کرداروں کی از سرِ نو تخلیق جہاں مصنف سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ اسے تاریخی حوالے سے کوئی ابہام نہ ہو وہیں ہیرو کے کردار کے لیے وہ اپنے تخیل سے وہ تمام خلا پر کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے جو تاریخ میں رہ جاتے ہیں۔ یوں ناظرین بھی مثالی اور ٹائپ ہیرو جس میں خوبیاں مبالغہ آمیزی کی حد تک بڑھی ہوتی ہیں کو پسند کرتے ہیں۔ ہیرو کسی بھی کہانی کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔ مگر تاریخی فکشن میں ہیرو کا کردار زیادہ نمایاں، اہم اور بنیادی ہوتا ہے۔ دراصل تاریخی فکشن میں تاریخ کا اہم دور یا مختلف ادوار ہیرو کے توسط سے دکھائے جاتے ہیں اور مصنف یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کس طرح یہ عظیم سورما تاریخ کا رخ متعین کرتا ہے۔ گویا تاریخی فکشن کا ہیرو اس نظریے کا عملی اظہار ہوتا ہے کہ تاریخ عظیم انسانوں کی داستان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی زبان کا تاریخی فکشن عام فکشن سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اس فکشن میں ہیرو اپنی شجاعت، جرات، بصیرت اور رومان سے رنگ بھرتا ہے۔ اور اگر فکشن نگار مثالی اور ٹائپ کے طرز پر ہیرو کی شخصیت میں مختلف خصائص کا استعمال نہیں کرتا تو عام طور پر ایسے ہیرو "کمزور کردار" بن جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں پوری کہانی اپنی تاثیر، دلچسپی اور اہمیت کھو بیٹھتی ہے۔ لہذا مثالی اور ٹائپ قسم کے ہیرو و تخلیق جس میں حقیقی انسان بھی جھلکتا ہو کسی بھی فکشن نگار کے فنی چابکدستی کا ثبوت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کے مطابق:

> "ناول نہ تو زندگی کی ہو بہو تصویر ہوتی ہے نہ محض تنقید حیات و تجدید حیات، کیونکہ یہ بات طے ہے کہ ناول کیسی ہی حقیقت کیوں نہ ہو، وہ ہرگز دلچسپ نہیں ہو سکتی جب تک اس میں تخیل کی آمیزش نہ ہو اور کوئی بھی داستان ایسی نہیں دکھائی جا سکتی جس میں تخیل کی فراوانی کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ حقیقت نہ ملی ہو۔"[23]

تاریخی فکشن کی ہر معاشرے میں الگ سے اہمیت ہوتی ہے۔ فکشن کا ہیرو رومانوی بھی ہو سکتا ہے اور Every Man ہیرو بھی۔ مگر تاریخی فکشن کا ہیرو جب تک مافوق البشر کے قریب قریب نہ ہو، بات نہیں بنتی۔

تاریخ کے تقاضے فکشن کے تقاضوں سے مختلف ہیں۔ لہذا تاریخی فکشن کا مصنف نہ تو بے تعصب ہو سکتا ہے اور نہ ہی جذبات و عقائد کو بالائے طاق رکھ سکتا ہے۔ تاریخ کے دلچسپ پہلو اور کرداروں کی رومان پرور کہانیوں کو مورخین جہاں درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے وہیں تاریخی فکشن کے لیے ان میں بہت سا مواد موجود ہوتا ہے۔ تاریخی فکشن کا مصنف حقائق کو دلچسپ اور رومان پرور بنانے کے لیے ان پہلوؤں پر خصوصی توجہ دیتا ہے جن سے مورخین انحراف کرتے ہیں۔ فکشن ایک تخلیقی عمل ہے چاہے وہ تاریخی ہی کیوں نہ ہو۔

اب تک کی مباحث سے یہ بات واضح ہوئی کہ تاریخی فکشن کا ہیرو، ہیرو مختلف اقسام کے اشتراک سے نمو پاتا ہے۔ وہ جہاں تاریخ کی داستان بیان کرتا ہے وہیں فکشن نگار کے تخیل سے رنگین ہوتا ہے۔ تاریخی فکشن کے ہیرو کا خمیر جہاں جہاں تاریخ کے عظیم انسانوں سے کچھ کوائف لیتا ہے تو وہیں تاریخی فکشن کے ہیرو کی خصوصیات بھی اس میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ لہذا آج کا تاریخی فکشن نگار اگرچہ حقائق کی پیشکش میں مثالی اور ٹائپ کرداروں کے اوصاف کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔

ہ۔ تاریخی فکشن کے ہیرو کے طور پر ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" میں ارطغرل کے کردار کا جائزہ

ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" میں "ارطغرل" ڈرامے کا ہیرو ہے۔ اس کا کردار بطور ایک عظیم مجاہدِ اسلام کا ہے۔ جس نے مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد کے لیے جہاد کا راستہ اپنایا اور بہت سی قربانیاں دیں، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے ایک سنہری دور کا آغاز ہوا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو چکا ہے اور تمام ترک مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہ تمام قبائل خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، سفر کرتے ہوئے جہاں سرسبز علاقہ آتا ہے یہ قبائل وہی پڑاؤ ڈال لیتے ہیں۔ انہی قبائل میں ایک قبیلہ "قائی" ہے۔ یہ افراد اور وسائل کے لحاظ سے بھی مضبوط قبیلہ ہے۔ ہنر مندوں اور جنگجوؤں سے پُر اس قبیلے کا سردار سلیمان شاہ ہے۔ جو سچا مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہادر سپاہی اور رحمدل انسان ہے۔ ان کا مقصد اسلام کی اشاعت اور انصاف کا بول بالا کرنا ہے۔ اس وقت مسلمان ہر جگہ کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔ منگول ہلاکو خان کی سربراہی میں بڑھتے چلے آ رہے تھے اور خلافتِ عباسیہ کو تخت و تاراج کرنے کے بعد سلجوقی سلطنت ان کے نشانے پر ہے۔ بازنطینی اور صلیبی اپنی سازشوں کے جال میں

مسلمانوں کو پھانس رہے ہیں۔ مسلمانوں کی مضبوط اور شان دار سلجوقی سلطنت ان سازشوں کے باعث روبہ زوال ہوتی جارہی ہے۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ مسلمان متحد ہو کر ان مشکل حالات کا مقابلہ کریں۔ سردارِ قبیلہ سلیمان شاہ کے چار بیٹے ہیں جو انتہائی بہادر، جنگجو اور انصاف پسند ہیں۔ سلیمان شاہ تمام قبائل کو متحد کر کے مسلمانوں کو صلیبیوں کی سازشوں کا پردہ چاک کرنا چاہتا ہے۔

شام کے علاقے پر سلطان صلاح الدین ایوبی کے پوتے سلطان ملک العزیز ایوبی فرماں روا ہے جبکہ اناطولیہ میں سلجوق سلطان علاؤالدین کیقباد کی حکمرانی ہے۔ صلیبیوں کے مقاصد میں ان دونوں مسلمان حکومتوں کو لڑا کر مسلمانوں کا خاتمہ کرنا ہے۔

سلیمان شاہ ان سازشوں کے ختم کرنے کے لیے ہمیشہ اہم کردار ادا کرتا ہے جس کے باعث یہ دونوں حکمران سلیمان شاہ اور اس کے قبیلے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

سردار سلیمان شاہ کی وفات کے بعد ارطغرل قائی قبیلہ کا سردار بن جاتا ہے۔ یہ انتہائی ذہن، بہترین، جنگجو اور اعلی سیاسی بصیرت کا حامل نوجوان ہے۔ صلیبیوں کے خلاف نبرد آزما ہونا اور اس سلسلے میں کسی طرح کے خطرے کو خاطر میں نہ لانا ارطغرل کے واضح ترین خصائص میں سے ہے۔ مستقبل پر گہری نظر اور دور اندیشی ارطغرل کے کردار کو دوسرے بھائیوں سے ممیز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلیمان شاہ سرداری کے لیے ارطغرل کو نامزد کرتے ہیں باوجود اس کے کہ دو بڑے بھائی ہیں اور اس کا نمبر تیسرا ہے۔

ارطغرل سردار بننے کے بعد صلیبیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے اور ان کی سازشوں کو اس طور ناکام بناتا ہے کہ اب ارطغرل صلیبیوں کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بن چکا ہے۔ سلجوق سلطنت کی عمل داری میں صلیبیوں کا قلعہ کارہ چاہسار ہے جو ان کی سازشوں کا گڑھ ہے۔ ارطغرل پہلے سیزن میں اس قلعے کو فتح کرتا ہے۔

ارطغرل کی شادی سلطان علاؤالدین کی بھتیجی حلیمہ سلطان سے رومان پرور محبت کے بعد ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ ارطغرل کا حلیمہ سلطان، اس کے والد شہزادہ نعمان اور اس کے بھائی کو صلیبیوں کی قید سے چھڑانا ہے۔ حلیمہ کے بطن سے ارطغرل کے تین بیٹے گندوز، ساوچی اور عثمان پیدا ہوئے۔ تیسرے بیٹے کی پیدائش کے بعد حلیمہ سلطان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ ارطغرل تمام عمر اسلام دشمن عناصر کے ساتھ جنگ کرتا رہا۔ جس میں اسے بہت نمایاں کامیابیاں ملیں۔ اس نے منگول، صلیبی اور بازنطینی فوج کے بڑے بڑے کمانڈروں کو شکست دی اور

انہیں قتل کیا۔

سلجوق سلطنت منگولوں کے ہاتھوں ختم ہو جاتی ہے تو ارطغرل تمام قبیلوں کو سوغوت کے علاقے میں اکھٹا کرتا ہے، صلیبیوں سے فتح کیے گئے علاقوں کو ایک ریاست کی شکل دیتا ہے، جہاں تعلیم و تربیت کے لیے درسگاہیں تعمیر کی جاتی ہیں اور تاجروں اور ہنر مند افراد کے لیے ساز گار ماحول بنایا جاتا ہے۔۔ اس سارے نظام کے پیچھے ابن العربی کی شخصیت ارطغرل کے لیے پیر و مرشد کے طور پر راہنمائی کرتی ہے اور ساتھ ہی "سفید داڑھی والے" نامی ترک خفیہ ایجنسی اُس کی پشت پناہی کر رہی ہے۔

آخری سیزن کا اختتام یوں ہوتا ہے کہ ارطغرل منگولوں کا خاتمہ کرنے کے لیے فیصلہ کن جنگ کا ارادہ کرتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے منگول سلطان برکے خان جو اب مسلمان ہو چکا ہے کو اپنا اتحادی بناتا ہے اور ساتھ ہی مصر کے سلطان رکن الدین بیبرس کو اس عظیم مشن میں اشتراک پر آمادہ کر لیتا ہے۔ طے پاتا ہے کہ ایک بڑی فوج تیار کی جائے جس میں تمام ترک قبائل شریک ہوں گے۔ اس سے بیشتر کے ساتھ ارطغرل کی دوسری شادی ہوتی ہے اور نکاح کے بعد ارطغرل اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اناطولیہ میں منگولوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔

تاریخی فکشن کے ہیرو کے طور پر "ارطغرل" کے کردار کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے تو یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ارطغرل تاریخ کی کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جو بہت معروف ہو، سابقہ صفحات میں ہم نے ارطغرل کی تاریخی حیثیت اور مقام و مرتبہ جاننے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا ان کی شخصیت کے حوالے سے عثمانی روایات کے علاوہ ان کے نام کا ایک سکہ اور بازنطینی مورخ کی تحریر کے علاوہ کوئی ایسا تاریخی ثبوت نہیں ملتا جو ارطغرل کو بہت بڑی شخصیت ثابت کر سکے۔ عثمانی روایات میں جن کی تحریر کا آغاز بھی ارطغرل کی موت کے سو سال بعد ہوا تھا، پر مورخین بھی بہت زیادہ بھروسہ نہیں کرتے۔ گویا یہاں ڈرامانویس کو یہ سہولت میسر رہی کہ ان کے ڈرامے کا ہیرو معروف شخصیت کا مالک نہیں تھا سو ایسے میں وہ اسے اپنے نظریے اور مرضی کے مطابق ترتیب دے کر پیش کر سکتے تھے۔

زیر تحقیق ڈرامے کے پانچ سیزن ہیں۔ ارطغرل ان پانچوں سیزن کا ہیرو ہے۔ لیکن اس ہیرو شپ کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ہیرو ہوتے ہوئے ہر سیزن میں مختلف انداز اور زیادہ طاقت کے ساتھ ظاہر ہوتا

ہے۔ گویا یہ رہتا تو ہیرو ہی ہے مگر ہر سیزن میں پہلے سے ایک قدم بڑھا ہوا، زیادہ بالغ نظر، زیادہ پر سکون اور گہرا، زیادہ پختہ کار۔ یوں یہ ہیرو جو ناظرین کو پہلے سیزن میں ہی بھا جاتا ہے نہ صرف اپنی عظمت اور بلندی کو برقرار رکھتا ہے بلکہ ہر سیزن میں اپنے مطلوبہ مقاصد اور عزائم کو حاصل کرتا ہوا وہ ناظرین کا پسندیدہ ہیرو بنا رہتا ہے۔

ذیل کے مندرجات میں ہم تاریخ میں تصورِ ہیرو، فکشن میں تصورِ ہیرو اور تاریخی فکشن میں تصورِ ہیرو کی روشنی میں ڈراما سیریل ارطغرل غازی کے ہیرو "ارطغرل" کے کردار کا جائزہ لیں گے۔

## ارطغرل: ایک عظیم جنگجو

"ارطغرل غازی" ایک تاریخی ڈراما سیریز ہے۔ ڈراما نگار مہمت بوز داغ نے ارطغرل کی مجاہدانہ سرگرمیاں دکھاتے ہوئے تاریخ کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ کیونکہ تاریخی ڈراموں کے ناظرین کا مزاج اور ذوق دوسرے ناولوں کے ناظرین سے اس لحاظ سے مختلف ہوتا ہے کہ وہ عہدِ رفتہ کے اس دور میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ جس میں ان کی قوم کی عظمت و رفعت بامِ عروج پر پہنچتی ہو، مجاہدین اسلام کے گھوڑوں کی ٹاپیں، میدان جنگ میں چمکتی، لہراتی دشمنوں پر قہر ڈھاتی تلواروں کی چھنکاریں اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے جہاں ڈرامانویس کے نقطہ نظر کے مظہر ہوتے ہیں وہیں ناظرین کے پسندیدہ مناظر! سو ہم دیکھتے ہیں زیر تحقیق ڈرامے میں "ارطغرل" ایک ایسا ہیرو ہے جو بنیادی طور پر ایک جنگجو ہے۔ اس کی پیدائش ایک ایسے قبیلے میں ہوئی ہے جو فنِ حرب و ضرب کا ماہر ہے۔ خود ارطغرل ایک سردار کا بیٹا ہے اور ایک سپاہی بھی! اس کا سب سے پہلا تعارف جو ہمارے ساتھ ہوتا ہے وہ ڈرامے کی پہلی قسط میں یوں دکھایا جاتا ہے کہ قبیلے کا لوہار جو کہ تلوار ساز بھی ہے اور ارطغرل گرم لوہے کو تلواروں میں ڈھال رہے ہیں۔ ولی دمیر ایک ضرب لگاتا ہے اور کہتا ہے

"حق ہے اللہ"

(ارطغرل گرم لوہے پر بھاری ہتھوڑے سے دوسری ضرب لگاتے ہوئے کہتا ہے۔)

"سچ ہے واللہ"[24]

ارطغرل: دمیر بھائی ذکر اللہ کا ہو تو لوہا بھی موم بن جاتا ہے۔ دمیر ٹھیک کہا تم نے اور یوں ان کی تلواریں جذبہ جہاد سے سرشار دشمنوں کے گلے کاٹتی چلی جاتی ہیں۔ اسی موقع پر لوہار ولی دمیر ارطغرل کو ایک تلوار تحفے میں دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ خاص آپ کے لیے بنائی ہے۔ ارطغرل بہت خوشی سے یہ تلوار لیتا ہے، سراہتی ہوئی

نظروں سے دیکھ کر کہتا ہے:

ارطغرل: (تلوار کو دیکھتے ہوئے) کیا بات ہے! قہر بن کر ٹوٹے گی یہ دشمنوں پر۔

ولی دمیر: یہ تم جیسے بہادر کے ہاتھ میں رہ کر مظلوموں کا دفاع کرے گی۔ سدا فتح مند رہو۔

ارطغرل: ذوالفقار سے بڑھ کر کوئی تیغ نہیں، نہ علیؑ سے بڑھ کر کوئی بہادر ہے۔[25]

ڈرامے کی پہلی قسط کے آغاز کے ساتھ ہی ہیرو کے یہ مکالمے اس کے کردار کی خوبیاں واضح کر دیتے ہیں کہ وہ جنگجو ہے اور بہادر ہے۔ آگے چل کر واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک بے خوف، نڈر، جرات مند اور حوصلہ مند جنگجو ہے۔

اس کے ساتھ ہی اگلے منظر میں ارطغرل اپنے تین جنگجوؤں کے ساتھ جنگل میں شکار کے لیے جاتا ہے جہاں کچھ صلیبیوں کا ایک دستہ تین مظلوم قیدیوں کو گھسیٹتا ہوئے لیے جا رہا ہے۔ ارطغرل بہادری اور بے خوفی کا ثبوت دیتے ہوئے محض تین ساتھیوں کے ہمراہ اس پورے صلیبی دستے سے ٹکر لے لیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس پورے دستے بشمول اس کے کمانڈر جس کا نام بسول ہے کو واصلِ جہنم کر دیتا ہے۔ قیدیوں میں ایک نوجوان لڑکی، اس کا کمسن بھائی اور ان کا باپ ہے۔ دراصل یہ قیدی سلطان علاؤالدین کیقباد کا بھائی اور اس کے بچے ہیں۔ صلیبی انہیں سلجوق سلطنت کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ارطغرل کی مداخلت کے باعث اس سازش کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ نوجوان لڑکی حلیمہ سلطان ہے جو سلطان کی بھتیجی ہے۔ یہیں سے ارطغرل اور حلیمہ سلطان کی محبت کا آغاز ہوتا ہے جو ان دونوں کی شادی پر منتج ہوتا ہے۔ لیکن یہ شادی کوئی آسان نہ تھی۔ یہاں بھی ارطغرل کی بہادری، بے خوفی، جرات اظہار کے ساتھ ساتھ محبت میں اس کی ثابت قدمی ہی اسے کامیابی کی طرف لے جاتی ہے۔ حلیمہ اپنے باپ اور کمسن بھائی کے ساتھ ارطغرل کے اصرار پر ان کے قبیلے میں بطور مہمان آ جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی قائی قبیلہ بہ یک وقت صلیبیوں اور سلجوق سلطنت کے زیرِ عتاب آ جاتا ہے۔

ڈرامے کا پہلا سیزن دو بڑے موضوعات پر مشتمل ہے۔ ارطغرل کی صلیبیوں کی سازشوں کو ناکام بناتے ہوئے انہیں حلب کے محل سے نکال باہر کرتا ہے۔ جبکہ وہ مسلمانوں کا روپ ڈھالے صلیبی جاسوس تھے۔ قائی قبیلے کو جو زمین امیر حلب العزیز نے دی تھی وہ بھی دراصل وہاں پر موجود ایک صلیبی غدار ناصر کے کہنے پر دی تھی۔ صلیبی چاہتے تھے کہ قائی قبیلے کا اور بالخصوص ارطغرل کا خاتمہ کر دیں۔ اس مقصد کے لیے اگر قائی قبیلہ

ان کے قلعے کے عین نیچے ہو گا تو یہ کام بہت آسان ہو جائے گا۔ مگر ان کی یہ چال خود ان کے گلے پڑ گئی اور ارطغرل نے یہ قلعہ جو کہ صلیبی سازشوں کا گڑھ تھا۔ جہاں بیٹھ کر وہ سلجوقیوں اور ایوبیوں میں غلط فہمیاں پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے کے خلاف کر رہے تھے۔ ان کے سروں پر دے مارا اور انہیں اس سرزمین سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس مہم کے دوران ہم دیکھتے ہیں کہ ارطغرل نہ صرف بہادری اور جرات سے یہ سازش، ہر مشکل اور برائیوں کا مقابلہ کرتا ہے بلکہ وہ قدم قدم کامیابیوں کے جھنڈے گاڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کی بے باکی حلب کے محل میں اس وقت بھی نظر آتی ہے جب امیر العزیز اس کے قبیلے کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور اسے فوری چلے جانے کا کہہ دیتا ہے۔ یہ حکم سن کر امیر کا ایک پاسبان جیسے ہی ارطغرل کو باہر نکالنے کے لیے اسے شانے سے پکڑتا ہے تو ارطغرل اسے زمین پر پٹخ دیتا ہے۔ یہ دیکھ کر دو اور پاسبان آگے بڑھتے ہیں تو ارطغرل آن کی آن میں ان تینوں کو چاروں شانوں چت کر دیتا ہے۔ امیر حلب اس کی اس بہادری سے بہت مرعوب ہے اور آخر کار زمین کے معاملے پر اس سے مکالمے کے لیے تیار ہو کر اسے رات کے کھانے پر مدعو کر لیتا ہے۔ اسی دوران ارطغرل پر صلیبیوں کی جانب سے تین قاتلانہ حملے ہوتے ہیں مگر وہ انتہائی بہادری اور معاملہ فہمی سے ہر بار ان حملوں سے بچ نکلتا ہے۔

امیر حلب سے خطہ اراضی حاصل کرنے میں کامیابی ارطغرل کو اس کے قبیلے اور سلیمان شاہ کی نظروں میں اور بھی معتبر بنا دیتی ہے۔ سلیمان شاہ ارطغرل کی بہادری کے ساتھ ساتھ اس کی ذکی الحسی اور معاملہ فہمی کے بھی قائل ہیں لہذا وہ اکثر و بیشتر اسے بڑے بھائیوں کی نسبت زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

ارطغرل کی بہادری محض جسمانی طور پر میدانِ کارزار میں دشمنوں کے روبرو ہی نہیں نظر آتی بلکہ وہ روحانی اعتبار سے بھی ایک مضبوط کردار کے طور پر ابھرتا ہے۔ وہ دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے ہمیشہ اسے للکارتا ہے۔ اپنی شکست اور غم کی حالت میں بہت باوقار رویہ اختیار کرتا ہے۔ انتہائی نامساعد اور مشکل میں حوصلہ مندی سے آگے بڑھتا ہے۔ امیر ہو یا بادشاہ اس کی جرات اظہار کسی دنیاوی منصب سے مات نہیں کھاتی۔ جو حق سمجھتا ہے اسے برملا کہہ دیتا ہے۔

حلیمہ سلطان کی حقیقت جاننے کے بعد سارا قبیلہ بلکہ اس کا بڑا بھائی بھی اس سے خائف ہے۔ کہ گویا ارطغرل نے ان قیدیوں کی مدد کر کے اور انہیں قبیلے میں پناہ دے کر پورے قبیلے کو ایک بڑی مشکل میں ڈال دیا

ہے۔ مگر ارطغرل بہت پر سکون ہو کر اس مشکل سے نکلنے کی تدبیر کر تا ہے۔ اس کے مطابق: "دشمن ہمیں ہر وقت چوکنا اور بیدار رکھتا ہے"۔[26]

دشمنوں پر فتح کی صورت میں وہ ان پر ظلم و ستم روا نہیں رکھتا بلکہ ان سے قصاص لیتا ہے۔

دوسرے سیزن میں ارطغرل کو منگول کمان دار نویان کا سامنا ہے۔ یہ منگول صلیبیوں سے کہیں زیادہ وحشی اور خوں خوار ہیں۔ ظلم و ستم کے ذریعے اپنا تسلط قائم کرنا ان کا شعار ہے۔ سارا سیزن ارطغرل اور منگولوں کے درمیان ہونے والی معرکہ آرائی پر مشتمل ہے۔ سارا قبیلہ بشمول ارطغرل کے بھائی منگولوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر ان سے مقابلہ کرنے کی بجائے پہاڑوں میں پناہ لینے کو ترجیح دینا چاہتے ہیں۔ مگر ارطغرل ان کے خلاف نبرد آزما ہے وہ ان کو شکست دے کر ان کا اپنی زمینوں سے مکمل خاتمہ چاہتا ہے۔ نویان کے سپاہی اپنے سربراہ تنکوت سے مل کر آخر کار ارطغرل کو قید کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نویان اس پر بدترین ظلم کر تا ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں میخ گاڑھ دی جاتی ہے۔ اس کے قبیلے کو آگ لگا دی جاتی ہے۔

اور قائی قبیلے ارطغرل کے ماموں کے قبیلے دودور گا قبیلہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ارطغرل کو منگول کمانڈر چنگیز خان کی فوج میں شامل ہونے کا کہتا ہے جس کے نتیجے میں ارطغرل کو بہت مال و دولت اور ان خطوں پر حکمرانی کی پیشکش کی جاتی ہے۔ ارطغرل اس وقت چاہتا تو کوئی چال چل سکتا تھا تاکہ اس کے لیے کوئی فرار کا راستہ نکل آئے، مگر وہ ایسا نہیں کر تا وہ بہت طریقے سے منگول فوج کے ظلم و ستم برداشت کر تا ہے۔

اس سارے کھیل میں نویان اکیلا نہیں بلکہ سلجوقی سلطنت کے غدار بھی شامل ہیں۔ جن میں سب سے نمایاں نام سلطان علاؤالدین کا سب سے قریبی اور بھروسہ مند امیر سعد الدین کوپیک ہے۔ وہ بھی ارطغرل کی بہادری اور بے باکی سے خوفزدہ ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح ارطغرل کا خاتمہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں وہ نویان سے ملنے جنگل میں جہاں منگول فوج کا پڑاؤ ہے، چلا آیا ہے۔ اسی دوران ارطغرل کو نویان کے خیمے میں لایا جاتا ہے جبکہ وہ جنگلیوں کی طرح گوشت کا پارچہ چپا رہا ہے۔ ارطغرل کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے نویان اسے کھانے کی دعوت دیتا ہے اور ارطغرل کو اپنی طرف متوجہ پا کر کہتا ہے:

> "تو تم وہ بہادر ہو جس نے صلیبیوں کو شکست دی، جو حلب کے امیر العزیز کا دوست بن گیا، جس نے سلجوقوں کے ساتھ خونی رشتہ جوڑا۔۔۔ اور بغیر کسی خوف کے

میرے سپاہیوں کا خوں بھی بہایا۔"

ارطغرل:

"اور تم وہ بے غیرت منگول کماں دار نویان ہو جو عورتوں کی عصمت دری کرتا ہے،
شیر خوار بچوں کا قتل کرتا ہے اور پھر ایسے اتراتا ہے جیسے بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔"

ارطغرل کی یہ بے خوفی نویان کے سپاہیوں کو حیرت اور نویان کو مرعوب کر رہی ہے۔ نویان اسے بہت ڈراتا دھمکاتا ہے۔

ارطغرل: تم چاہتے کیا ہو۔۔۔ جب مجھے مار سکتے ہو تو مارا کیوں نہیں؟

نویان: ایک طاقت ور جنگجو کی زندگی کی قیمت باقی زندگیوں سے زیادہ ہوتی ہے ارطغرل!

ارطغرل: مگر میں تمہارے لیے موت کا فرشتہ بن کر آؤں گا نویان!

نویان: اگر تم اپنی ماں، بیوی اور قبیلے کے لوگوں کو امن سے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ چلو، ہمارے بنو، ہمارے ساتھ فتوحات حاصل کرو"

ارطغرل: بزدلوں کی طرح لڑنا، شیر خوار بچوں کو قتل کرنا، ہمارے نزدیک فتح نہیں شرم کی بات ہے۔۔۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں، ہم چنگیز خان کی فوج سے لڑ رہے ہیں۔ ایک ایک کر کے مرے سب پیارے مرتے گئے، ان میں میرا بھائی صارم بھی شامل ہے۔ اب تم میرے ساتھ دوستی کی بات کرو۔ جب تک میں زندہ ہوں، یہ اتحاد ممکن نہیں۔"[27]

یہ تیرہویں صدی کا زمانہ ہے جب منگول لشکر آندھی کی طرح دنیا فتح کرنے نکلے۔ سن 1206 میں منگولوں نے تموجن نامی نوجوان کو "چنگیز خان" کا لقب دیا۔ اس کا مطلب ہے "طاقت ور بادشاہ" یا "عالمگیر خان" اس کے علاوہ چنگیز خان کو "خاقان" یعنی عظیم خان کا لقب بھی دیا گیا۔چنگیز خان لے لشکر اپنے تیر اندازوں پر مشتمل تھے۔ جو گھوڑوں پر سوار ہو کر تیر بازی کے ماہرین تھے۔ یوں وہ جب دشمن پر حملہ آور ہوتے تو دیکھتے ہی دیکھتے ان کا ملیامیٹ کر دیتے تھے۔ انکارٹا انسائیکلوپیڈیا کے مطابق چنگیز خان جنگ بازی کے لحاظ سے "اسکندر اعظم یا نپولین اول کے برابر تھا"۔

باہجو نویان اوکتائی خان کی فوج کا منگول کمان دار تھا۔ جس کا تقرر اناطولیہ اور جارجیا میں تھا۔ ڈراما سیریل

میں بھی نویان کو اوکتائی خان کی جانب سے ترکی میں منگول فوج کا کمانڈر دکھایا گیا ہے۔ جو نہ صرف جنگی امور کا ماہر ہے بلکہ سیاسی جوڑ توڑ کا بھی ماہر ہے۔ وہ سعد الدین کوپیک کی ملی بھگت سے سلجوقی سلطنت کو تباہ کرنا چاہتا ہے تا کہ منگول حکمرانی یہاں بھی قائم کی جاسکے۔

ارطغرل کو نویان کی قید کے دوران ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور جب وہ کسی نہ کسی طرح اس قید سے بھاگ نکلتا ہے تو اب اس کی سیاسی بصیرت پہلے سے کہیں بڑھ چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جرگے میں اس سے منگولوں کے بارے میں رائے پوچھی جاتی ہے تو وہ کہتا ہے:

"منگول فوج ایک قبیلے میں داخل ہوتی ہے اور ہر کسی کو مار دیتی ہے، بچے، بزرگ، عورتیں کسی میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔ لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں اس ڈر کو ختم کرنا ہو گا۔ یہاں بیٹھ کر جنگ کا انتظار کرنا بلکل ایسے ہے جیسے اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودنا اور اپنی موت کا انتظار کرنا۔"[28]

ارطغرل کا موقف ہے کہ جنگ اس وقت ہی نہیں کی جاتی جب یہ آپ پر مسلط ہو جائے بلکہ اس وقت بھی اس کی تیاری کر کے ظالم پر حملہ آور ہونا چاہیے جب وہ ظلم کرنے کی منصوبہ بندی کر چکا ہو۔

وہ نہ صرف ایک بہادر جنگجو ہے بلکہ جراتِ اظہار اور جراتِ عمل اس کی بہادری کے خصائص ہیں۔ دور دوگاہ قبیلہ جس کے سردار ارطغرل کی والدہ حائم خاتون کے بھائی ہیں، میں امیر سعد الدین کوپیک کا بھیجا ہوا غدار گومشتیگن جو اب سردارِ اعلی بن چکا ہے جب پکڑا جاتا ہے تو خود امیر سعد الدین اسے بچانے کے لیے چلا آتا ہے۔ اس کا جاہ جلال اور شاہی پروٹوکول قابلِ دید ہے۔ وہ آتے ہی ارطغرل سے گومشتیگن کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ (جبکہ اس وقت ارطغرل کی تلوار گومشتیگن کی گردن پر ہے) اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں پورے قائی قبیلے کے عبرتناک انجام کی دھمکی دیتا ہے۔ سارا مجمع مبہوت مرعوب اور خوفزدہ ہے۔ مگر ارطغرل پر ان دھمکیوں اور جلال کا کچھ اثر نہیں ہوتا:

امیر سعد الدین: سلطان علاؤالدین کیقباد کی طرف سے میں حکم دیتا ہوں کہ روکا جائے اس سزا کو۔

(ارطغرل یہ سن کر مسکراتا ہے اور گومیشتگین کی گردن پر تلوار پھیرتا ہے)

امیر سعد الدین: (شدید غصے سے) ارطغرل! اس کی گردن سے ہٹاؤ اپنی تلوار میں یہاں اس لیے آیا ہوں

کہ اپنے سردار اعلیٰ پر لگے الزامات کی تحقیق اور چھان بین کروں۔

ارطغرل: دونوں قبائل کے سرداران نے اس آدمی کو سزا دی ہے۔ جو کورگت سردار کی بیوی کا قاتل ہے۔ سردارِ اعلیٰ نہیں۔

امیر سعد الدین: ارطغرل حد میں رہو اپنی (انتہائی غصے میں سپاہیوں کو تلواریں سونتنے کا حکم دیتا ہے)

ارطغرل: ثابت ہوا کہ اس نے یہ قتل سردارِ اعلیٰ بننے کے لیے کیے ہیں۔ قائی اور دوردو گاہ قبیلے کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے اس نے۔

امیر سعد الدین: اب میں ارطغرل اور گومیتشسگین کو اپنے ساتھ سرائے لے جاؤں گا اور پوچھ گچھ کروں گا۔ حقائق کو سب کے سامنے لانا میرے اور سلطنت کے لیے بہت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر دونوں قبائل کے سرداران سلطنت کے خلاف بدترین باغی تصور کیے جائیں گے۔ اور اگر میری بات رد کی گئی تو پھر کیا ہو گا تمہارا انجام سوچ لو ارطغرل اچھی طرح۔ تو اس لیے سزا کو روکا جائے فوراً۔

ارطغرل: یوسفؑ کی راہ پر چلنے والے حق کی راہ پر چلنے سے گھبراتے نہیں الحمدللہ!

امیر سعد الدین: تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں ارطغرل گومیتشیگن کو حوالے کرو میرے۔

ارطغرل: (بغیر مرعوب ہوئے انتہائی پر وقار اور پر عزم دکھائی دے رہا ہے امیر سعد الدین کا بیان سنتے ہی گومتشیگں کی گردن اپنی تلوار سے ایک ہی وار سے گومتشیگن کا کٹا ہوا سر بالوں سے پکڑتا ہے اور امیر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

ارطغرل: اب لے جانا چاہو تو لے جا سکتے ہو اسے۔"[29]

پورے مجمعے پر ایک سکتہ طاری ہے۔ ہر ایک لرزاں و خوفزدہ ہے مگر ارطغرل اپنے اقدام پر انتہائی مطمئن ہے۔ جبکہ اس کے برعکس جب ارطغرل نویان کی قید میں تھا تو قائی قبیلہ اور دودور گاہ قبیلہ مشترکہ طور پر کاروائی کر کے نویان کو پکڑ لیتے ہیں اور اسے رسیوں میں باندھ کر کھینچتے ہوئے قبیلہ لے آتے ہیں۔ قائیوں کی نمائندگی ارطغرل کا بڑا بھائی گلدارو کر رہا ہے اور دودور گاہ کی کمان تنمکین کے ہاتھ ہے۔ عین اس وقت جبکہ نویان کا سر کٹنے ہی والا ہے۔ امیر سعد الدین کوپیک اپنے پورے شاہی پروٹوکول کے ساتھ مداخلت کرتا ہے اور نویان کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ گلدارو اور دوسرے عمائدین کچھ خوفزدہ ہیں اور کچھ امیر سعد الدین کوپیک کے موقف کی تائید میں

نویان کو چھوڑ دیتے ہیں تا کہ مستقبل میں انہیں امیر سعد الدین کے عتاب کا سامنانہ ہو۔یہی غلطی اور کوتاہ بینی ان کے گلے پڑتی ہے اور مستقبل میں بہت سی بلائیں ساتھ لاتی ہے۔ اس کے برعکس ارطغرل کی یہ خصوصیت کہ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا اور جس چیز کو سچ سمجھتا ہے پھرپوری قوت سے اس پر عمل پیرا بھی ہوتاہے وقتی طور پر تو مشکل میں ڈالتی ہے مگر مستقبل میں بہت فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

ارطغرل کی بہادری کے اس طرح کے مظاہرے ہمیں آر کی ٹائپ ہیرو میں نظر آتے ہیں۔ جب بڑے بڑے عمائدین، جنگجو اور بہادر کسی نہ کسی تذبذب اور مصلحت کا شکار ہوتے ہیں اور پورے کا پورا قبیلہ یا معاشرہ جمود کی طرف بڑھ رہوتا ہے تو ہیرو واحد نجات دہندہ بن کر آتا ہے اور آن کی آن میں پوری بازی پلٹ جاتی ہے۔ ناظرین جو اس طرح کی صورت حالات میں انتہائی گھٹن اور بے چینی محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ ہیرو کا اقدام ان کی سانسیں بحال کر دیتا ہے، وہ خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں۔ وہ جس اقدام کے متمنی ہوتے ہیں ہیرو اس کی عملی تصویر پیش کر دیتا ہے۔ تھامس کارلائل کے الفاظ میں: "ہیرو سب سے پہلے دوسروں کی تقلید کے نمونے کے طور پر کام کرتا ہے اور دوسرا تخلیق کار کے طور پر تاریخ کو آگے بڑھاتا ہے نہ کہ پیچھے کی طرف"[30] یوں ہیرو کے اقدامات معاشرتی جمود میں تحرک پیدا کر کے اسے آگے کی جانب بڑھاتا ہے۔

یوں ارطغرل کی بہادری، بے باکی، جراتِ اظہار، مقابلہ بازی غموں اور تکلیفوں کو سہنے کی غیر معمولی صلاحیت اور حوصلہ مندی اس کے عظیم جنگجو کے کردار کے لیے ایک مکمل پیکج فراہم کرتی ہیں۔ ہم اسے فکشن کے تصورِ ہیرو میں بطور کلاسیکی ہیرو دیکھ سکتے ہیں۔ جن کی سب سے بڑی خصوصیت طاقت، ہمت، بہادری، شرافت اور ایثار ہے۔ یہ ہیرو، سپر نیچرل طاقتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ مگر ان کی مسلسل، کوششیں اور ریاضتیں ان کی ان صلاحیتیوں کو انتہائی کمال درجے تک پہنچا دیتی ہیں۔

ارطغرل بطور رومانوی ہیرو:

زیر تحقیق موضوع میں ہم ڈرامے کے ہیرو "ارطغرل" کا فکشن اور تاریخ میں موجود تصورِ ہیرو کے ساتھ ساتھ تاریخی فکشن میں ہیرو کے تصور کے تناظر میں مطالعہ کر رہے ہیں۔ ڈرامے میں جہاں اسے ایک جنگی امور کا ماہر انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی بہادری کو fenticize کیا گیا ہے وہیں اسے ایک رومان پسند ہیرو کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے۔ وہ محض میدان جنگ کا ہی رسیا نہیں بلکہ کاروبارِ محبت اور نرم جذبوں سے لبریز

انسان بھی ہے۔ وہ جہاں اقدار اور ثقافتی عناصر کی پیروی کرنے والا ہے وہیں معاشرے کی فرسودہ روایات اور غیر ضروری بندشوں کے خلاف بھی ہے۔ اس کے نزدیک "جو ہو رہا ہے ٹھیک ہے" درست رویہ نہیں بلکہ "جو ہونا چاہیے" زیادہ اہم ہے۔ اگرچہ اسے مستقبل کی فکر لاحق رہتی ہے مگر تخیل کی گرفت سے بھی آزاد نہیں ہے۔ یہ رومانوی رویہ میریضانہ نہیں بلکہ تخیل کی اس آزادی سے تخیل کا ایک ایسا سرچشمہ پھوٹتا ہے جو کسی منہ زور طوفان سے کم نہیں۔ لہذا

- حلیمہ سلطان سے محبت
- ترکوں کے عظیم الشان مستقبل کا خواب
- کفار اور صلیبیوں کو شکست دینا
- عدل وانصاف پر مبنی معاشرے کا قیام
- آزادی کی شدید خواہش / جذبہ جہاد / شوق شہادت
- اعتماد ذات اور خود پسندی

یہ وہ خصوصیات ہیں جو ارطغرل کو ایک رومانوی ہیرو کے طور پر متعارف کرواتی ہیں۔

جب سلیمان شاہ امیر حلب سے قبیلے کے لیے زمین کے حصول کے سلسلے میں ارطغرل کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتے ہیں تو یہ راستہ انتہائی پر خطر ہے۔ ایک طرف کارا نوئیگر جو سلجوق سلطنت کا امیر مگر اصل میں غدار ہے ارطغرل پر قاتلانہ حملہ کرواتا ہے کیونکہ حلیمہ سلطان اس کے والد اور باپ کو کاراتوئیگر نے ہی صلیبیوں کی قید میں دیا تھا اور ارطغرل انہیں چھڑا کر لے گیا تھا۔ دوسری طرف صلیبیوں کے دستے کی قیادت کرنے والا سپاہی بسول ٹائٹس کا بھائی تھا جسے ارطغرل نے اس حملے میں مار ڈالا۔ ارطغرل کے حلب جانے کی خبر ایک طرف کارا توئیگر کہلو کھٹکتی ہے تو دوسری طرف بسول کا بھائی ٹائٹس جو خود بھی صلیبیوں کا کمانڈر ہے ارطغرل کے قتل کے درپے ہے۔ ارطغرل بہرحال ان دونوں کے حملوں سے بچتا ہوا حلب کے محل پہنچ ہی جاتا ہے مگر وہاں بھی ناصر کی شکل میں صلیبی جاسوس موجود ہیں۔ حلب کے سفر کے دوران ہی ارطغرل کی ابن العربی سے پہلی ملاقات ہوتی ہے اور ابن العربی اپنی روحانی قوت سے ارطغرل کی قائدانہ صلاحیت کو پرکھ لیتے ہیں۔ یوں وہ اسے ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں اور بعد میں ارطغرل کے روحانی پیشوا اور قائد کی حیثیت سے اس کی مدد اور راہنمائی کرتے رہتے

ہیں۔

حلب کے میدان میں جہاں امیر العزیز کو اراضی کے لیے راضی کرنا ایک بہت بڑا چیلنج ہے تو دوسری طرف صلیبیوں کے قدم بہ قدم بچھائے ہوئے جال۔ ارطغرل کی بہادری اور ابن العربی کی روحانی مدد کے تحت بحر حال وہ کامیاب لوٹتا ہے تو سب سے پہلے حلیمہ سلطان سے ملنے جاتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ کس طرح اس کے خیال نے اسے قدم بہ قدم حوصلہ مندر رکھا اور ساتھ ہی اسے ایک آئینہ بطور تحفہ کے پیش کرتا ہے جو وہ اس کے لیے حلب سے لے کر آیا ہے۔ تلواروں کے سایے تلے اور ہر پل موت کا سامنا کرنے والا ارطغرل کسی صورت اپنی محبت سے بیگانہ اور غافل نہیں۔ یہیں رات کے کھانے میں جب اس کے والدین اس کی منگنی کے حوالے سے اپنے ارادے بتاتے ہیں تو وہ بڑے احترام سے انکار کر دیتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ابھی اسے حلیمہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں اور یہی بات اس کے والدین بھی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُدھر سلجان خاتون (جو ارطغرل کی بڑی بھابھی ہے۔ اسی کی چھوٹی بہن سے ارطغرل کا نکاح متوقع ہے) جب گورچے کو بتاتی ہے کہ بہت جلد اس کا نکاح ارطغرل سے ہونے والا ہے تو گورچے اسے کہتی ہے:

"گورچے: مگر باجی یہ بات مجھے پتا ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتا

سلجان خاتون: تمہیں کچھ نہیں پتا، ارطغرل کی پسند کیا ہے، سلیمان شاہ اگر گورچے سے اس کی شادی کا فیصلہ سنادیں گے تو کیا ارطغرل منع کر پائے گا اُن کو؟

گورچے: کیا فیصلہ ہو چکا؟

سلجان خاتون: ہاں! بس سلیمان شاہ نے اعلان کرنا ہے۔"[31]

گویا یہ بات قبائلی نظام میں تقریباً ناممکن ہے کہ اگر سردار اپنے بیٹے کے لیے کسی سے شادی کی بات طے کر دے تو بیٹا اس سے انحراف کر سکتا ہے۔ مگر ارطغرل نہ صرف اس شادی کا اعلان کرتا ہے بلکہ اپنے والدین کو اس کے لیے راضی بھی کر لیتا ہے۔ یہ شادی ایسی آسان نہ تھی جبکہ امیر حلب خود حلیمہ سلطان سے نکاح کا خواہاں ہے۔ نکاح کی تاریخ بھی طے ہو چکی ہے۔ حلیمہ امیر حلب کے محل میں ہے۔ کسی نہ کسی طرح ارطغرل اس سے ملاقات کرتا ہے۔

"ارطغرل: (حلیمہ کو دیکھتے ہوئے) اگر آج تم نہ آتی تو یہ زندگی جہنم بن جاتی۔

حلیمہ: کیسے نہ آتی میں ارطغرل۔ تم سے ملنے کے سوال چارہ ہی کیا ہے میرے پاس۔۔۔۔ اگر تم نے مجھے آزاد کرانے کی کوشش کی تو تمہارا قبیلہ العزیز کے زیر عتاب آجائے گا ارطغرل۔

ارطغرل: سب جانتا ہوں، وہیں تھا کل رات میں۔

حلیمہ: (روتے ہوئے بیٹھ جاتی ہے) میں بابا کی وجہ سے العزیز سے رشتے پر مجبور ہو گئی ہوں مگر میں ہرگز کسی اور کے نام سے منسوب نہیں ہو سکتی۔ خدا کے لیے مجھے اس جہنم سے نکال لو ارطغرل۔

ارطغرل: اگر یہ نہ کر سکا میں تو یہ سمجھ لینا کہ تمہارا ارطغرل مر چکا۔۔۔ حلیمہ ایک العزیز ہی کیا پوری دنیا بھی چاہیے تو نہیں چھین سکتی تمہیں مجھ سے، نہ تمہیں حوالے کروں گا ان کے نہ ان کے نہ ان ظالموں کو یہ اجازت دوں گا کہ یہ ظلم ڈھائیں سب لوگوں پر۔ میرا وعدہ ہے تم سے ضرور واپس آؤں گا۔"[32]

اور وہ آتا ہے۔ امیر حلب کے فوج کا مقابلہ کرتا ہوا، صلیبیوں کی سازشوں کا پردہ چاک کرتا ہوا اور سب کے سامنے حلیمہ کو لے جاتا ہے۔ دراصل صلیبی اس شادی کی آڑ میں ایوبیوں اور سلجوقوں میں بظاہر رشتہ استوار کروا رہے تھے مگر اصل میں وہ یہ چاہتے تھے کہ جوں کہ امیر حلب شادی کی تقریبات میں مشغول ہو، جو کہ چالیس دن تک چلنی تھیں اس دوران صلیبی اپنی قوت کے ساتھ حلب پر حملہ کر دیں گے۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے ناصر (جو کہ حلب کے محل میں صلیبی کا سب سے اہم آدمی ہے) العزیز کو حلیمہ سلطان سے نکاح کے لے رضامند کرتا ہے۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ ارطغرل اور حلیمہ سلطان کے جذباتی تعلق سے آگاہ ہے۔ یوں جہاں وہ ان دونوں میں جدائی ڈلوانا چاہتا ہے وہیں اس نکاح کے جشن میں جنگ کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ مگر ارطغرل نہ صرف حلیمہ کو العزیز سے چھڑا کر لے جاتا ہے بلکہ صلیبیوں کا پردہ اس طرح چاک کرتا ہے کہ العزیز بھی اس کا قائل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے اقدامات پر قائی قبیلے سے معافی مانگتا ہے اور ارطغرل سے دوستانہ مراسم سے استوار کر لیتا ہے۔

حلیمہ کو پا لینے کے بعد ارطغرل اپنے عظیم مقاصد کے حصول میں اور بھی زیادہ پرجوش ہو جاتا ہے۔ بظاہر وہ ایک قبیلے کے سردار کا بیٹا ہے جسے صلیبی اور محل کے لوگ "خانہ بدوش چرواہا" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں مگر ارطغرل ان کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ حلب سازشوں کا گڑھ ہے۔ لیکن حکام بالا اس کی تہہ تک نہیں

پہنچ پاتے، ارطغرل ایک مرتبہ ہی محل میں جاتا ہے اور صورتِ حال کا اچھی طرح تجزیہ کرلیتا ہے۔ اب وہ محض اپنے قبیلے کے مستقبل کا نہیں سوچ رہا بلکہ پورے عالمِ اسلام کا درد اور مصائب اس کا درد اور مصائب بن جاتے ہیں۔ حلب سے واپسی پر وہ جرگے میں کہتا ہے:

"حلب کی سلطنت زہریلے سانپوں کا مسکن ہے جہاں قدم رکھنا زندگی داؤ پر لگانے سے کم نہیں لیکن اگر ان زہریلے سانپوں کا ڈنگ توڑ دیا جائے تو عالم اسلام کو ایک بہت بڑی تباہی سے بچا جا سکتا ہے۔ صلیبی ایک بڑی جنگ کی تیاری میں ہیں، ان کا ہدف قدس کو مسلمانوں سے چھیننا ہے۔۔۔ ہمیں ہر صورت انہیں حلب سے اکھاڑنا ہو گا"۔[33]

یہ باتیں اور خواب کسی سلجوق شہزادے یا امیر کے نہیں بلکہ ایک خانہ بدوش قبیلے کے سردار کے بیٹے کے ہیں جس کے پاس وسائل تو کجا فی الوقت اپنے قبیلے کے پڑاؤ کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔

مگر اس کی ہیبت ایک طرف ایوبی سلطنت میں ہے تو دوسری طرف صلیبی بھی اسے اپنا سب سے بڑا حریف ماننے پر مجبور ہیں۔ جب وہ ترگت کو چھڑانے کے لیے کارڈینل تھامس کو اپنی حراست میں لیتا ہے تو کارڈینل پوچھتا ہے تم کون ہو لڑکے؟ ارطغرل بتاتا ہے کہ وہ قائی سردار سلیمان شاہ کا بیٹا ارطغرل ہے۔ کارڈینل اسے کہتا ہے: "حلب چھین لیا، قدس بھی چھین لیا، اب کیا صلیبیوں سے ان کا ملک بھی چھینو گے ارطغرل"۔[34]

اس طرح تیسرے اور چوتھے سیزن میں دنیا کی سب سے بڑی فوج منگول اور بازنطینی سلطنت میں ارطغرل کے نام کی دھاک بیٹھی ہے۔ وہ ارطغرل کا اپنی ذات پر اعتماد، اپنے اسلامی مجاہد ہونے کا فخر، مسلمانوں کو ایک پرچم تلے کرنے کا عظیم الشان خواب، اپنے احکامات اور فیصلوں پر عمل پیرا کرانے کی طاقت اور عدل و انصاف پر مبنی ایک ایسے معاشرے کا قیام جہاں مکمل طور پر اسلامی قوانین لاگو ہوں ارطغرل کو ایک رومانوی ہیرو کے طور پر سامنے لاتے ہیں۔ سلاطین اسے حقار تاً چرواہا کہہ کر بھی مخاطب کرتے ہیں۔ آخر کار وہ ارطغرل کو اپنا حریف یا دوست بنا لیتے ہیں۔ ارطغرل ہر جگہ اپنا تعارف "سلیمان شاہ کا بیٹا ارطغرل" کہہ کر کرواتا ہے۔ یہی احساس ذات اسے خود اعتمادی کے اس درجے پر فائز کرتا ہے جہاں وہ بس اللہ کے بھروسے بڑی سے بڑی طاقت سے بھڑ جاتا ہے۔ وہ جذبات سے بھرا ہوا اور میدانِ عمل کا سپاہی ہے۔ شوقِ شہادت اور کفار کی جان لینے کا جذبہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ جب تمام ترک قبائل یہی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ارطغرل عالم اسلام کی جنگ

لڑنے میں مشغول ہے۔ حتیٰ کہ اپنا بھائی بھی جنگ سے باز رہنے کا کہتا ہے مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ آخر پانچویں سیزن کی آخری قسط میں بھی برکے خان اور سلطان بیبرس سے اتحاد کر کے منگولوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ کے لیے روانہ ہو جاتا ہے تاکہ دنیا کو ان کے ظلم و ستم سے نجات مل جائے۔

دانائی اور ذہانت:

فکشن کے ہیرو میں جہاں بہادری اور رومان ساتھ ساتھ چلتے ہیں وہیں ان کی ایک بہت خوبی ان کی ذہانت اور دانائی ہوتی ہے۔ جہاں وہ میدانِ جنگ کا فاتح ہوتا ہے وہیں حکمت و دانائی اس کے ایسے ہتھیار ہوتے ہیں جن سے وہ میدان جنگ سے باہر کام لیتے ہوئے ایک کامیاب لیڈر بنتا ہے۔ وہ سیاسی بصیرت رکھتا ہے، معاملہ فہمی میں تاک ہے، دشمنوں کی سازشوں اور چالوں کو ان پر ہی پلٹ دیتا ہے، منافقوں اور غداروں کی پہچان اس کی اضافی خوبی ہے۔ دور اندیشی اسے مستقبل کا یقین کرنے میں مدد دیتی ہے اور دشمنوں کے ساتھ کیے گئے معاہدے اسے کبھی پسپا نہیں ہونے دیتے۔

اگر ہم مندرجہ بالا خصوصیات کے تناظر میں ارطغرل کے کردار کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ اسے ڈراما نگار نے ان تمام اوصاف سے متصف دکھایا ہے۔ وہ ایک قبائلی عمائد ہے۔ اس کے والد سلیمان شاہ کی خواہش ہے کہ تمام ترک قبائل متحد ہو جائیں اور سلجوق سلطنت کے وفادار رہیں۔ ان کے اس مشن کو صحیح طور پر ارطغرل آگے بڑھاتا ہے۔ بظاہر اس کی سیاسی تربیت کسی ادارے میں نہیں ہوئی مگر وہ اپنی بصریت سے کام لیتے ہوئے نہ صرف سیاسی سیاسیاتِ عالم پر نظر رکھتا ہے بلکہ مسلمانوں کا اس میں کردار کیا ہونا چاہیے اس حوالے سے بھی اس کے نظریات بہت واضح اور بالغ ہیں۔ پہلے سیزن سے لے کر پانچویں سیزن تک جس طرح وہ اپنے مخالفین کو سخت آزمائش سے گزارتا ہے اور جس طرح نئے نئے دشمنوں کی موجودگی سے گھبرانے کی بجائے اپنی تربیت کرتے ہوئے ان کے داؤ پیچ ان پر الٹتا ہے وہ بہت متاثر کن ہے۔ اسے معلوم ہے کہ قبیلہ پھر سلطنت کی مضبوطی کے لیے سب سے پہلے غداروں کا خاتمہ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دشمنوں کو اس کی کسی چال کا پہلے سے علم ہو جاتا ہے تو سب سے پہلا قدم جو اٹھاتا ہے وہ غدار کی تلاش ہے۔ اس معاملے میں وہ ابن العربی سے بھی زیادہ واضح موقف رکھتا ہے کہ کامیابی کے لیے سب سے پلے غداروں کا قلع قمع کرنا ہو گا۔ چونکہ وہ اسکی اہمیت سے آگاہ ہے لہذا اس کی نظر اس حوالے سے بہت تاک اور شاطر ہے۔ وہ پہلی نظر میں ہی ایسے شخص کو بھانپ لیتا ہے۔

سب سے پہلے اسے قبیلے میں موجود سردار کردوغلو پر شک ہے۔ کردوغلو بہت عیار ہے اور اپنی غداری کا ہر ثبوت اچھی طرح مٹا دیتا ہے۔ ارطغرل کا بڑا بھائی گلدارو کردوغلو کی باتوں میں آ کر اپنے خاندان کی مخالفت کرتا ہے مگر ارطغرل ایک پل کے لیے بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ کردوغلو غدار نہیں ہے۔ وہ بس ثبوت کی تلاش میں رہتا ہے جو کہ آخر کار اسے مل جاتے ہیں۔ یوں سارے قبیلے کے سامنے سلیمان شاہ ارطغرل سے کے ذریعے کردوغلو کی گردن کاٹنے کا حکم دیتا ہے۔ غداری کا یہ سلسلہ رکتا نہیں ہے۔ سلجوق سلطنت اور اسلامی ریاستوں کو غداروں کی موجودگی کیڑوں کی طرح کھا رہی ہے۔ یہ احساس ارطغرل کو ہی ہوتا ہے اور وہ چن چن کر ایک ایک غدار کو اس کے انجام تک پہنچاتا ہے۔ پہلے سیزن میں کردوغلو اور ناصر کو اپنی تلوار س ختم کرتا ہے۔ دوسرے سیزن میں کوچاباش تیسرے میں اورال، سیزن چار میں امیر سعد الدین کو پیک کو اور پانچویں سیزن میں الباسطی اور زانگوج کو ختم کرتا ہے۔

ارطغرل کا یہ اقدام جہاں اس کے قبیلے کو سیاسی استحکام بخشتا ہے وہیں پے در پے وہ اپنے دشمنوں کو شکست دیتا چلا جاتا ہے۔ تیسرے اور چوتھے سیزن میں اس کا سامنا ایسے دشمنوں سے پڑتا ہے جو سیاسی چالیں چلنے کے ماہر ہیں۔ محلاتی سازشوں نے انہیں بہت مکاری تو سیکھا رکھی ہے۔ جبکہ ارطغرل پہاڑوں اور قبائلی نظام کا پروردہ ہے جو اپنی نوعیت میں محدود امکانات رکھتا ہے۔ مگر ارطغرل کہیں رکتا نہیں۔ وہ خود تربیتی کے مراحل سے گزرتا ہے۔ دشمنوں کی چالوں سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ اس کا یہ نظریہ کہ شیر کی طرح سامنے آ کر دشمن کو للکار کر اس پر حملہ کرنا مردوں کا شیوہ ہے۔ اپنی جگہ بر قرار رہتا ہے۔ مگر جب اس کا سامنا بازنطینی کمانڈروں سے پڑتا ہے جو بظاہر اس سے دوستانہ مراسم رکھتے ہیں مگر درپردہ اسے نقصان پہنچانے ہیں تو وہ کہتا ہے:

> "میرے جاں بازو! اس سر زمین پر ہماری جنگیں مختلف ہوں گی۔ ہمیں اس ملک میں ہر روز اور ہر لمحہ محتاط رہنا ہو گا۔ دشمن چالوں پر چالیں چلیں گے۔ ان کی سازشوں کو ختم کرنے کے لیے، ان کی چالوں کو ختم کرنے کے لیے ہمیں ان کی زبان میں بات کرنا ہو گی۔ آج کے بعد جو ہم پر چھپ کر حملہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم بھی ان پر گھات لگا کر حملہ کریں گے"۔[35]

معاملہ فہمی اس کی دانائی کا ایک ایسا وصف ہے جس کی بنا پر بہت سے مسائل کو بڑھنے سے پہلے ہی قابو پا

لیتا ہے۔ باقی لوگ جب کسی دشمن کی جانب سے کیے گئے اقدام کی پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں تو ارطغرل دشمن تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔ طریقہ واردات سے دشمن کا پتا لگا لینا اور سارے معاملے کو فوراً بھانپ لینا اس کا خاصہ ہے۔ سیزن چار میں جب وہ غلام فروشوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو اسے بازنطینی زمیندار کو بیچ کر بھاری رقم کمانا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے وہ بازنطینی فوج کے جال میں پھنس چکا ہے اور اس کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ وہ مر چکا ہے کیونکہ اس لڑائی کے بعد ایک جلی ہوئی لاش کے پاس سے ارطغرل کی انگوٹھی برآمد ہوتی ہے، اور ارطغرل کا کہیں سراغ نہیں ملتا تو یہ طے ہو جاتا ہے کہ ارطغرل کو جلا کر مار ڈالا گیا ہے۔ جبکہ اس دوران میں وہ شدید زخمی ہو کر جیسے تیسے بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور غلام فروشوں کی قید میں آجاتا ہے۔ امیر سعد الدین کوپیک جو ریاست کا سب سے بڑا غدار ہے ارطغرل کا جانی دشمن اس موقع سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کے چھوٹے بھائی کو جو اب سردار بن چکا ہے اس بات پر قائل کر لیتا ہے کہ وہ ہانلی بازار جو قائی قبیلے کا تجارتی مرکز ہے اور جس پر ان کی اور باقی ترک قبیلوں کی معیشت انحصار کرتی ہے کو بیچ ڈالے۔ امیر سعد الدین دراصل بازنطینی زمیندار کو یہ بازار دینا چاہتا ہے جس کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اس نے بظاہر ارطغرل کو مروا ڈالا ہے۔ یہ معاہدہ وہ ایک ترک سردار کے توسط سے کرواتا ہے جو اس کا اپنا مہرہ ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مسلمان قبائل کسی صورت ایک کافر کے ہاتھ اپنا تجارتی مرکز فروخت نہیں کریں گے۔ لہٰذا وہ چال چلتا ہے کہ ترک سردار کو بازطینی زمیندار سے سونا لے کر دیتا ہے کہ بازار کی خریداری کی جائے۔ امیر سعد الدین یہ سارا کام اس ہوشیاری اور ذہانت سے کرتا ہے کہ کسی کو امیر سعد الدین کی اس مداخلت پر سائبہ بھی نہیں گزرتا۔ اس تجارتی مرکز کے قائیوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ معاشی طور پر ٹوٹ گئے ہیں اور انہیں ان زمینوں سے (سوغوت) ہجرت کرنا پڑے گی جس کی خاطر قائی قبیلہ ایک عرصے سے قربانیاں دے رہا ہے۔

عین اس وقت جب یہ معاہدہ طے پا رہا ہے، دونوں فریق ارطغرل کا بھائی اور سردار اس پر دستخط کر رہے ہوتے ہیں، ڈرامائی طور پر ارطغرل کی انٹری ہوتی ہے۔ وہ امیر سعد الدین کی موجودگی سے ہی سارے معاملے کو بھانپ جاتا ہے۔ معاہدے کے کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے ارطغرل کی انتہائی غیر متوقع آمد جبکہ امیر سعد الدین اور زمیندار اپنی دانست میں اسے مار چکے ہیں، سب کو ورطہ حیرت میں ڈالنے کے ساتھ ساتھ، پسپائی اختیار کرنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ اس کے سارے دشمن اکٹھے ہو کر اس کے بعد اس کے قبیلے کو

تباہ و برباد کرنے کا معاہد کر چکے ہیں۔ ہائلی بازار ارطغرل نے بزورِ شمشیر لیا ہو تا ہے۔ سو وہ مکالمے اور دلائل میں دشمن کو شکست دیتا ہے اور ہانلی بازار واپس لے لیتا ہے۔ ورنہ ارطغرل کا بھائی دوندار سمجھ رہا ہو تا ہے کہ امیر سعد الدین سلجوق سلطنت کے امیر ہونے کے ناطے اس کے قبیلے کے لیے ہمدردی رکھتے ہوئے اس کی خیر خواہی کر رہے ہیں۔ یوں وہ اپنی دانائی سے نہ صرف معاملات کی پیچیدگی کو سمجھ لیتا ہے بلکہ دشمنوں کی چالوں کو ان پر پلٹ دیتا ہے۔

دور اندیشی بھی اس کی دانائی کی ایک صفت ہے۔ وہ صرف حال کو بہتر کرنے کی فکر نہیں کرتا بلکہ مستقبل کا خیال اسے دور رس فیصلے کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ بازنطین کی طرف ہجرت بھی اس کی دور اندیشی کی واضح مثال ہے۔ وہ مستقبل میں ترکوں کی حالت دیکھ رہا تھا کہ اگر ان کے پاس زمینیں نہ ہوئیں تو نہ ہی ان کی نسلیں پروان چڑھ سکیں گی اور نہ ہی وہ اقوامِ عالم میں اپنا کوئی مقام و مرتبہ پائیں گے۔ ترک قبائل منگولوں کے حملوں سے تنگ آ چکے ہیں، زیادہ منگول فوج میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ مگر ارطغرل کے مطابق جنگ ناگزیر ہے، تاریخ نے بھی ثابت کیا جو لوگ جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے ان پر بھی جنگ مسلط کی گئی۔ اس نے غداروں کو ختم کیا، دشمنوں کی مخبری کا نظام استوار کیا اور ان کے لیے آنے والی رسد اور کمک پر حملے کر کے ان کی معاشی کمر توڑ دی۔

دوسرے سیزن کی قسط 20 میں جب اس کے قریبی جنگجو عبدالرحمن کو دوردوگاہ قبیلے کے سپاہی پکڑ کر قید کر دیتے ہیں۔ قبیلے کے غدار نے اسے غدار کے طور پر دکھایا ہے۔ اب جب اسے جرگے میں سزائے موت دی جاتی ہے تو قائی قبیلے کے جنگجو بہت بے چینی میں ہیں۔ سب کو پتا ہے کہ عبدالرحمن بے گناہ ہے۔ وہ ارطغرل سے انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ اگر یہ فیصلہ جرگے نے کیا ہے تو اس کا احترام سب پر ضروری ہے۔ بظاہر ارطغرل کا یہ فیصلہ اس کے خلاف کر دیتا ہے مگر دراصل ارطغرل کوئی اور چال چل رہا ہے۔ عبدالرحمن کو سزائے موت دینے کے لیے انتظامات کیے جا رہے ہیں کہ ارطغرل اسے اپنے ساتھیوں کی مدد سے قید سے چھڑا دیتا ہے۔ وہ منگول فوج کے کمانڈر کے پاس پناہ لینے چلا جاتا ہے اور یوں ارطغرل دشمنوں کی طرز پر اپنا بھی ایک مخبر منگولوں میں بھیج دیتا ہے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکا کہ اس کے پیچھے ارطغرل کا ہاتھ ہے حتیٰ کہ منگول غدار کو چاباش بھی۔ سب عبدالرحمن کو باغی تصور کرتے رہے اور وہ ارطغرل کو منگولوں کی خبر دیتا رہا۔

## انصاف پسندی:

"حملے کا وقت آ چکا، اب جدوجہد ہماری ہو گی اور فتح اللہ کی، انشاء اللہ ہم سرخرو لوٹے گے کیونکہ ہماری جنگ حق اور انصاف کے لیے ہے"

"اے اللہ ہمیں انصاف اور رحم پھیلانے اور ظالمانہ اقدامات کے خاتمے کی توفیق دے"[36]

یہ وہ الفاظ ہیں جو بار بار ارطغرل کی زبان سے دعا کرتے وقت اور دشمنوں پر حملہ آور ہوتے وقت جاری رہتے ہیں۔ وہ ایک بہادر جنگجو ہے جس نے اپنی تلوار کے زور سے دشمنوں کے ظالمانہ قبضے کو ختم کیا اور بہت سے ترک قبائل کو استحصالی نظام سے نجات دلائی۔ ڈرامے کے بہت سے مناظر ہیں وہ جہاں اپنے الفاظ سے نظام انصاف کو رائج کرنے کا اعلان کرتا ہے وہیں اس کے لیے عملی اقدامات بھی اٹھاتا ہے۔ اس کے خوابوں میں ایک خواب پر امن اور انصاف پر مبنی معاشرے کا قیام ہے۔

سیزن چار میں جب وہ عیسائی ٹیمپلرز سے ہانلی بازار چھین لیتا ہے تو پہلا فرمان یہ جاری کرتا ہے۔

"۔۔۔۔فساد کا خاتمہ ہو گیا۔ اب انصاف نافذ ہونا ہے۔ جو کوئی ایمان داری سے تجارت کرے گا، میرے بازار میں اسے انصاف ملے گا۔ جو عزت داری اور منصفانہ معاملہ کرے گا، میرا رحم دیکھے گا"۔[37]

اس طرح عدالتوں کا قیام اور اشرافیہ کے مقدمات کا ان عدالتوں میں قائم کیا جانے انصاف کی فراہمی کی جانب عملی اقدام ہے۔ تیسرے سیزن میں جب اس کے مشترکہ دشمن اُورال اور بازنطینی کمانڈر ویسولیس کی پے درپے سازشوں کے عوض امیر سعدالدین ارطغرل سے ہانلی بازار کی چابی لے کر اسے اس سے بے دخل کر دیتا ہے تو ارطغرل قبیلے واپس جا کر تمام معاملات پر غور و فکر کرنے کے ساتھ ساتھ تشویش و تحقیق کرتا ہے۔ ثبوت اکھٹے ہو جانے کی صورت میں وہ پہلے سلطان علاؤالدین کو خط لکھ کر تمام صورت حال سے آگاہ کرتا ہے اور پھر امیر سعدالدین سے کہتا ہے:

"امیر حضرت ہم جتنی جلدی ممکن ہو، عدالت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے سلطان کو خط لکھ کر سب کچھ بیان کر دیا ہے۔ میں عدالت میں حقیقت سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ امن کی خاطر میں ایسی جان دینے کے لیے تیار ہوں۔۔۔"[38]

اگر وہ اس وقت چاہتا تو قانون کو ہاتھ میں لے سکتا تھا مگر ماورائے عدالت انصاف اسے قبول نہ تھا۔ باوجود یہ کہ اسے امیر سعد الدین پر بھی اعتبار نہیں ہے۔ وہ خلافِ انصاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔ اس بات سے امیر سعد الدین بھی از حد متاثر ہوتا ہے اور اسے ہانلی بازار کی چابی واپس دے کر تمام اختیارات اس کے حوالے کر دیتا ہے۔

اسی طرح جب اس کے بڑے بیٹے گندوز پر ا یلپنگے خاتون کے والد کے قتل کا الزام لگایا جاتا ہے جو کہ ریاست کی جانب سے قائی قبیلے سے محصولات اکٹھے کرنے آئے ہیں تو ارطغرل اپنے بیٹے کو عدالت میں پیش کرتا ہے۔ انصاف اور عدالت کے تمام تقاضے پورے ہونے ہیں اور گندوز باعزت بری ہو جاتا ہے۔

پانچویں سیزن میں جب ٹیمپلز اسے زہر دے دیتے ہیں اور بادی النظر میں ارطغرل مر چکا ہے جبکہ وہ دشمن کو اپنی موت کی خبر دے کر ایک چال چل رہا ہے۔ اپنے گھوڑے پر سوار جب وہ اپنی اگلی منزل کی جانب رواں دواں تو اس کی دعا ان الفاظ میں دہرائی جاتی ہے۔

> "اللہ رب العزت، کلام پاک، اپنے مقدس پرچم اور اپنی تلوار کی قسم کھاتا ہوں۔۔۔۔
> انصاف اور رضائے الٰہی کے راستے میں مشکلات پیدا کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔ ظلم کرنے والوں کے انجام تک ہار نہیں مانوں گا"۔[39]

### مظلوموں کی دادرسی:

انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کا مقصد لیے ارطغرل کے کردار میں پہلے سیزن سے لے کر آخری یعنی پانچویں سیزن تک ایک نمایاں وصف اس کے مظلوموں کے ساتھ ہمدردی ہے۔ وہ نہ صرف مظلوموں کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے بلکہ پوری قوت سے اس ظلم کے خلاف اقدام کرتا ہے۔ پہلے سیزن کی پہلی قسط میں حلیمہ سلطان، اس کے والد شہزادہ نعمان اور اس کے بھائی لئیت جب ٹیمپلرز کے ظلم و تشدد کا شکار ہیں تو وہ ان کی فوری مدد کرتا ہے۔ جبکہ وہ نہیں جانتا کہ مظلوم کون ہے اور نہ ہی اس کی مدد اس بات کی متقاضی ہے۔ اسی سیزن میں امیر حلب العزیز کے وزیر اعظم شہاب الدین کو جب صلیبیوں کی سازشوں کے نتیجے میں پھانسی دے جا رہی ہے۔ اس وقت وہ تختہ دار تک اپنے جنگجوؤں کے ساتھ پہنچ جاتا ہے اور اسے اسی طرح جاوٗدار قبیلے کے سردار جاندار کا بیٹا اورال غصے سے بالکل پاگل ایک بوڑھے غلام کو سونے کے پانچ سکوں میں خرید کر اپنے تیر سے نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ ارطغرل وہاں پہنچ کر دس سکوں کے عوض بوڑھے کو اورال سے خرید کر آزاد کر دیتا ہے۔

چاؤ دار قبیلے میں جب کوئی مرد سردار نہیں رہتا تو سردار کی بیٹی اصلاحان خاتون اپنی صلاحیتوں اور حسب نسب کی بنا پر اس کرسی کی مستحق ہے۔ مگر اس کا چچا ایسا نہیں کرنے دیتا، اصلاحان کو ڈرا دھمکا کر قید کر دیا جاتا ہے۔ ارطغرل اسے سرداری کے منصب پر بحال کراتا ہے۔ اسی طرح ایلگے خاتون کے ساتھ ہونے والے مظالم پر اس کا پورا ساتھ دیتے ہوئے اسے بھی سرداری دلاتا ہے۔ ان کا خواتین ہونا ارطغرل کو ایسا کرنے سے روک نہیں سکتا۔ صلیبی قلعے اور بازنطینی قلعے کو فتح کر کے بے شمار سونا اور مالِ غنیمت ملنے پر وہ خود کچھ نہیں رکھتا۔ اسلامی قانون کے مطابق اس کی تقسیم کرتا ہے اور اپنا حصہ غریبوں اور شہدا کے خاندانوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

رجائیت پسندی:

ارطغرل بد سے بد حالات اور سنگین صورت حال میں بھی ناامید نہیں ہوتا۔ وہ ایک ایسا ہیرو دکھایا گیا ہے جس کے مشن کے دوران قدم بہ قدم مشکلات ہیں، صرف کامیابیاں ہی نہیں ناکامیاں بھی اس کی ہمت اور حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ وہ اس وقت بھی مطمئن اور پر سکون رہ کر اگلی تدبیریں سوچنے کا عادی ہے جب باقی تمام لوگ ناکامی کا ماتم کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنی اسی خوبی کے باعث وہ اپنے قبیلے کی امید بن جاتا ہے۔ اس کی موجودگی تمام قبیلے کو زندہ اور جواں ہمت رکھتی ہے اور اس کی غیر موجودگی میں سارا قبیلہ کمزوری کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ پہلے سیزن میں جبکہ سیاسی اعتبار سے اس کی کوئی مستحکم حیثیت نہیں ہے، اس وقت بھی وہ بڑا قدم اٹھانے کی جرات رکھتا ہے۔ جس بات کے بارے میں اسے یقین ہو جائے کہ وہ سچ ہے، پھر کوئی طاقت اسے اس سے پیچھے نہیں دھکیل سکتی۔ انتہائی نامساعد حالات میں بھی وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ حلیمہ سلطان، اس کے والد اور بھائی کو قبیلے لانے سے وہ اور اس کا قبیلہ چاروں طرف سے مشکلات میں گھر جاتا ہے۔ صلیبی اور سلجوق غدار تو ایک طرف قبیلے میں موجود غدار اس کے خلاف ہونے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، وہ ہرگز خوف اور تذبذب کا شکار نہیں ہوتا، نہ ہی اسے اپنے کیے پر کوئی پچھتاوا ہے۔ کرانوئیگر قبیلے آکر انھیں سنگین نتائج کی دھمکی دیتا ہے۔ حلیمہ صورتِ حال بھانپ کر ارطغرل کو بتاتی ہے کہ وہ ان کی خاطر پورے قبیلے کو آگ میں نہ جھونکے تو وہ کہتا ہے کہ تمام جہان اگر ظالم ہو جائے تو بھی ہم ڈرنے والے نہیں ہیں حلیمہ ہم قائی قبیلے کے مسلمان ترک ہیں، ہم ظالموں سے ڈرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔

نویان کی قید ہو یا حلب کے محل میں ہونے والا ظلم و ستم، قبیلے میں قحط اور بھوک ہو یا قونیہ کے محل میں

سلطان کے قتل کے جھوٹے الزام میں نظر بند، ارطغرل کبھی ناامید اور مایوس نہیں ہوتا اس وقت جو دعا اس کے لبوں پر ہوتی ہے وہ بہت وسیع المعنی اور رجائیت سے بھرپور ہے۔

> "اے میرے رب تونے کبھی کسی پر اتنا بوجھ نہیں ڈالا جس کو وہ اٹھا نہ سکتا ہو۔۔۔
> مجھے اس بوجھ کو اٹھانے کی ہمت عطا کر۔ تونے یوسف کو کنویں سے نکال کر مصر کا
> بادشاہ بنا دیا اور حضرت ابراہیمؑ کو آگ سے محفوظ رکھا۔ یارب مجھے اس پستی سے
> نکال کر بلندی کی طرف لے جائیں"۔[41]

مندرجہ بالا خوبیوں کے ساتھ جو خوبی بحیثیت مجموعی ہمیں ارطغرل کی ذات میں نظر آتی ہے وہ اسلامی روایات کی پاسداری ہے۔ ہم نے تاریخی فکشن کے ذیل میں پڑھا کہ دراصل تاریخی فکشن نگار کے نزدیک اپنی قوم کے شاندار ماضی کو قوم کے سامنے زندہ کر کے اسے بطور مثال پیش کرنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم شکست خوردہ یا مایوس ہو تو ایسی صورتِ حال میں تاریخی فکشن اپنے ماضی کو زیادہ شاندار بنا کر پیش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں فکشن نگار حقیقت کے ساتھ تخیل اور تخلیق کا مرکب تیار کرتا ہے۔ تاریخی فکشن کا ہیرو جہاں فکشن کے روایتی ہیرو کے اوصاف لیے ہوتا ہے وہیں وہ ایک ایسا ہیرو بھی ہوتا ہے جس کی ذات میں جہاں آرکی ٹائپ اور مثالیت ہوتی ہیں وہیں مسلسل ارتقا اس کردار کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ وہ کبھی کلاسیکل ہیرو کے طور پر سامنے آتا ہے تو کبھی رزمیہ ہیرو کی طاقتوں سے مبرا ہوتا ہے۔ اس میں کچھ کمالات آرکی ٹائپ اور مثالی ہیرو کے ہوتے ہیں تو کہیں حقیقت سے قریب تر ایسے بشری اختصاص جو عام انسانوں میں ناپید ہوتے ہیں۔ گویا تاریخی فکش کا ہیرو بیک وقت تاریخ اور فکشن دونوں سے مواد لیتا ہے۔

تاریخی فکشن کے ہیرو کے طور پر ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کا ہیرو ارطغرل نہ صرف تاریخ اور فکشن میں تصور ہیرو کے اوصاف کا حامل ہے بلکہ اس کردار کا مسلسل ارتقاپذیر رہنا اسے "فوق البشر" کے قریب لے آتا ہے۔ جہاں انسان میں صلاحیتوں اور کمالات کے لامحدود امکانات ہیں۔ مسلسل ریاضت اور جدوجہد ان امکانات کو عملی صورت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ قدیم یونانی شاعر ہومر Homer نے مردِ آزاد کا تصور پیش کیا۔ فیثا غورث نے تصورِ انسان کو اپنا موضوع بناتے ہوئے بتایا کہ بہتر انسان وہ ہے جو اپنی آرزوؤں کو بے اعتنائی کا شکار نہ ہونے دے اور توازن قائم رکھے۔ سقراط کا تصورِ "حکیم خود آگاہ" اور شیخ ابن العربی کا تصورِ انسان کامل

دراصل اسی نظریے کے آئینہ دار ہیں کہ انسان میں صلاحیتیوں اور طاقتوں کا ایک سمندر آباد ہے۔ انسان اپنی محنت، ریاضت، غور و فکر مجاہدے اور مشاہدے سے ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا بلند ترین سطح پر پہنچ سکتا ہے۔

ارطغرل کا مطالعہ ہمیں اس ارتقائی سفر کی داستان بھی سناتا ہے۔ پہلے سیزن میں اس کی جذباتیت حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ احساسِ ذمہ ذات اسے دوسروں کے جذبات اور افکار کو سمجھنے میں حائل ہے۔ وہ اپنی مانی کرتا ہے۔ خود کو بہترین اور اپنے فیصلوں کو سب سے افضل سمجھتا ہے۔ جن دنوں قائی قبیلہ دودور گاہ قبیلے میں قیام پذیر ہے۔ اس کا بڑا بھائی اسے پر امن رہنے اور جنگ سے باز رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ پہلے سپاہیوں اور قبیلے والوں کے کھانے پینے اور رہائش کا انتظام ہونا چاہیے تبھی وہ دشمن کے خلاف لڑ سکیں گے۔ یہ ایک دانش مندانہ فیصلہ تھا اور اس پر مکالمہ ہو سکتا تھا مگر ارتغرل بھائی کو بزدلی کا طعنہ دے کر معاملہ بگاڑ دیتا ہے۔

"گلدارو: (ارطغرل کا بڑا بھائی) جنگ نہیں ہو سکتی ارطغرل۔ اب ہم مزید لاشوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔

ارطغرل: آپ بزدل ہیں بھائی، بہت بزدل!"[42]

اس کے برعکس سیزن چار میں جب اسے ہانلی بازار میں ہر طرح کی قوم اور دشمنوں سے واسطہ پڑتا ہے تو وہی ارطغرل جو سوائے جنگ اور تلوار سے کم کسی چیز پر راضی نہ تھا اپنے جنگجوؤں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ: "اس سرزمین پر ہمیں اپنے دماغ کو تلوار سے بھی زیادہ تیز بنانا ہو گا۔۔۔ تب ہی ہم یہاں رہ سکیں گے"۔

ایک ارطغرل وہ ہے وہ پہلے سیزن میں حلیمہ سلطان کو کھو دینے کے ڈر سے سب کچھ چھوڑ دینے کے ارادے باندھ رہا ہے۔ حلیمہ کے سوا اسے سب کچھ بے معنی اور بے مقصد نظر آتا ہے۔ اس کے نزدیک محبت اور محبوب ہی اصلِ حیات ہے مگر محبت میں کامیابی کے بعد وہ یہاں تک محدود نہیں رہتا۔ اس کے مقاصد میں واضح طور پر پرچمِ اسلام کی سربلندی اور عدل و انصاف پر مبنی معاشرے کا قیام ہے۔ جس کے لیے وہ انتہائی بالغ نظری سے محنت کرتا ہے۔ تیسرے سیزن میں حلیمہ سلطان کی وفات کے بعد اس کی اپنے مقصد سے لگن اور سنجیدگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ حلیمہ کو بھولا ہرگز نہیں ہے مگر اس کے جذبات کی شدت میں واضح تبدیلی آئی ہے۔ اب وہ جذبے کی بجائے غور و فکر اور جنگ کے ساتھ ساتھ قربانی کی اہمیت کو بھی سمجھ چکا ہے۔ کجا وہ اپنے لباس سے سکول کی تھیلی نکالنے والے انسان کو بغیر تحقیق کیے ہاتھ کاٹ ڈالتا ہے اور کجا وہ اپنے بدترین دشمن اور غدار سلطنت کا سر کاٹنے کے لیے بھی سلطان کے احکامات کا منتظر رہتا ہے!

# حوالہ جات


1.https://www.oxfordlearns dictionaries.com

2۔ آل احمد سرور، فکشن کیا؟، کیوں؟ اور کیسے، (مضمون) ریختہ اردو

3. Thoams Carlyle, on Heroes, Hero-worship and the Heroic in History, University press new, London 2013, pg.8

4. Ibid

5۔ لیوٹالسٹائی، جنگ اور امن، فکشن ہاؤس، لاہور، 2013، ص12

6. What is a Classical Hero? http://www.storyboardthat.com

7۔ ماہ جبین منکائی، پاکستان کی اینٹی ہیرو، بلڈی نسرین، سے ملاقات (کالم) ہم سب، دسمبر 3، 2018

9. TCk Publishing.com. 8 types of Heros in Fiction.

10. Poetics: chapter XIII? Sparknotes www.sparknotes.com

11. Christiansen, Rupert, Romantic Affinities: Portratis From an Age, 1780-1830,1989, cardinal ISBNO7474-0404-0

12. http://www.oxfordlearners dictionaries.com

13. Thomas Caryle, on Heroes ,Hero-Worship and the Heroic in History, page.8

14۔ رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، اردو میں تاریخی ناول ابلاغ، لاہور 1994، ص82

15۔ محمد اسلم قریشی، ڈاکٹر، المیہ، ماورا پبلشرز، لاہور 1987، ص132

16۔ نسیم حجازی، شاہین، جہانگیر بکس، لاہور 1948، ص182

17۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، 1980، ص198

18۔ نجم الہدیٰ، ڈاکٹر، کردار اور کردار نگاری، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ، 1980، ص87

19۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2000، ص28

20۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، 2018، ص11

21۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مغرب میں نفسیاتی تنقید، سنگِ میل پبلی کیشن، لاہور 2006، ص55

22۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، 2018، ص226

23۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، تاریخ ادب انگریزی، کراچی یونیورسٹی بہ اشتراک مقتدرہ قومی زبان، 1986، ص380

24۔ ارطغرل غازی (اردو) پی ٹی وی ہوم، سیزن 1، قسط 1

25۔ ایضاً

26۔ ایضاً، قسط 3

27۔ ایضاً، سیزن 2، قسط 18

28۔ ایضاً، قسط 27

29۔ ایضاً، قسط 69

30. Thomos Kanlyle. On Hero, Heroworship

31۔ ارطغرل غازی۔ سیزن 1، قسط 50

32۔ ایضاً، سیزن 1، قسط 34

33۔ ایضاً، سیزن 1، قسط 25

34۔ ایضاً، قسط 54

35۔ ایضاً، سیزن 5، قسط 2

36۔ ایضاً، سیزن 4، قسط 13

37۔ ایضاً، سیزن 4، قسط 13

38۔ ایضاً، سیزن 3، قسط 42

39۔ ایضاً، سیزن 5، قسط 53

40۔ ایضاً، سیزن 1، قسط 8

41۔ ایضاً، سیزن 1، قسط 24

42۔ ایضاً، سیزن 2، قسط 9

باب چہارم

# مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات

## الف: ارطغرل سے متعلق تاریخی واقعات اور ڈراما "ارطغرل غازی" میں ارتباط و تفاوت کا مجموعی جائزہ

تاریخ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اقوام کا حافظہ ہوتی ہے، قومیں اپنی تاریخ سے صرف ماضی کے ساتھ رشتہ استوار نہیں کرتیں بلکہ ان کے لاشعور سے لے کر شعور تک، ان کے قومی مزاج اور نفسیاتی صورت گری تک تاریخ اور تاریخی شعور ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مگر اہم بات تو یہ ہے کہ کوئی قوم بالخصوص اس کے علما تاریخ کو کس زاویے سے دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ وہ تاریخ سے کس قسم کے سبق حاصل کرتے ہیں اور نوجوانوں کے لیے اس سے کیا نتائج دیے ہیں۔ اور پھر سب سے اہم یہ ہے کہ ماضی کو حال کے س اتھ کسی طرح جوڑتے ہیں؟ تاریخ کی تفہیم و تشریح اپنی جگہ مگر مستقبل میں اس کا اطلاق کس کس نقطہ نظر سے کیا جاتا ہے یہ بات تاریخ کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر سامنے لے کر آسکتی ہ۔

موضوع زیر تحقیق "ڈراما سیریل ارطغرل غازی" بنیادی طور پر تاریخی واقعات اور کرداروں سے اخذ کیا گیا ڈراما ہے اور یہ بات ڈرامے کے آغاز میں ہی ایک تعارفی نوٹ کی صورت میں واضح کر دی گئی ہے۔ یہ تاریخی ڈراما مذہبی پس منظر میں تشکیل دیا گیا ہے۔ جمہوریہ ترکی میں چونکہ آجکل اسلام پسند حکومت ہے اسلامی تعلیمات اور اسلامی ماحول اس ڈرامے کی بڑی خوبیاں ہیں۔ پانچ سیزن پر مبنی ایک کامیاب ڈراما بنانا جہاں ایک چیلنج ہوتا ہے وہیں مذہبی فکر کو اس کا بنیادی موضوع بنا کر پیش کرنا بہر حال ایک مشکل کام ہے۔ ایسے طویل ڈراموں کی دلچسپی بر قرار رکھنے کے لیے اگر وہ مذہبی نہ ہوں تو دنیا بھر میں ایک طریقہ بڑا کامیاب سمجھا جاتا ہے اور وہ ہے غیر ضروری طور پر "بولڈ مناظر" کی بھر مار، جس میں عام طور پر خواتین اور ان کے لباس میں بے تکلفی برت لی جاتی ہے۔ اس سے ڈراموں کے ناظرین کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اگر ڈراما مذہبی نوعیت کا ہو تو ایسا کرنا تنقید کا باعث بن جاتا ہے تو ایسی صورت میں ڈرامے کو ناظرین میں مقبول کرنے کے لیے عام طور پر دو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

اول، ڈرامے میں جنگی مناظر کی بھرمار ہوتی ہے۔ دشمنوں اور کافروں کے ساتھ لڑائیاں / جہاد کے مناظر سے ناظرین کی مذہبی دلچسپی اور جوش و جذبہ بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے اس جذبے کی تقویت کی خاطر طویل سیریل دلچسپی اور شوق سے دیکھتے ہیں۔ دوم، ناظرین کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لی اس طرح کے ڈراموں میں سنسنی بیم ورجا کے واقعات کا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے۔ جو غداروں، دشمنوں، خفیہ اداروں اور روحانی مدد کی صورت میں ہوتا ہے۔ یوں یہ دونوں عناصر یعنی جنگ و جدل اور سنسنی طویل ڈراموں کو کامیاب بنانے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ جب یہ سب کچھ تاریخ کے نام پر کیا جائے تو ناظرین ایسی مافوق الفطرت باتوں میں حقائق سے زیادہ دلچسپی اور کسی حد تک ایمان بھی لے آتے ہیں۔

زیر تحقیق ڈرامے میں دراصل ان دونوں عناصر سے از حد مدد لی گئی ہے۔ نیز اداکاروں کی اداکاری، پس منظری میوزک، فلم بندی، ہدایت کاری اور دیگر تکنیکی معاملات میں جو مہارتیں دکھائی گئیں ہیں وہ قابلِ تعریف ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ جو نقطہ اس ڈرامے کو عام لوگوں میں پسندیدگی عطار کرتا ہے وہ اس کا دین کو ایک زندہ اور قابل عمل حقیقت بنا کر پیش کرتا ہے۔ دینی اور اخلاقی تعلیم کو مستقل طور پر ڈرامے میں پیش کیا گیا ہے۔ ابن العربی آلیارے، الیاس فقیہ، سوغوت کا قاضی، مسلمان عدالتوں کے منصف یہ کردار تو مستقل اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و تشریح کے ساتھ ساتھ اسلام کی عملی صورت پیش کرتے نظر آتے ہیں جبکہ دوسرے کردار بھی اسلامی شعار کو اپنی زندگیوں میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ قرآن پاک کا احترام، دین سے محبت اور امتِ مسلمہ کے لیے دردمندی کے جذبات کم و بیش ہر قسط میں دکھائے گئے ہیں۔ اسی طرح نماز، تلاوت، قرآنی آیات کی تفسیر، احادیث کا بیان، اسلامی تاریخ سے واقعات کا بیان اور پھر اسلام کے قانونِ عدل و انصاف کو دنیا سے ظلم کے خاتمے کے لیے واحد حل کے طور پر دکھایا گیا ہے۔

اگرچہ سابقہ صفحات میں ہم نے تفصیلی طور پر ارطغرل کے تاریخی کردار اور ڈراما سیرل "ارطغرل غازی" میں ڈرامائی کردار کا جائزہ لیا جن کے مطاق ارطغرل سے متعلق جو بھی تاریخی شواہد موجود ہیں وہ بہت ہی محدود ہیں۔ مستند تاریخی حوالوں میں ارطغرل سے متعلق ایک سکہ اور بازنطینی مورخ کی ایک مختصر تحریر کے سوا تاریخ کے صفحات فل الوقت خاموش ہیں۔ ممکن ہے اس ڈرامے کے بعد مزید کوئی تاریخی ثبوت یا تحقیق سامنے آئے تاہم ارطغرل کے بارے میں زیادہ تر معلومات افسانوی اور داستانوی نوعیت کی ہیں تاہم جس بات پر

مورخین متفق ہیں وہ یہ کہ ارطغرل کا تعلق ایک ترک خانہ بدوش قبیلے سے تھا۔ جو قائی قبیلہ کہلاتا تھا۔ اس کے والد سلیمان شاہ اس قبیلے کے سردار تھے۔ یہ قبیلہ بھی دیگر قبائل کی طرح تاتاریوں کی سیاہ کاریوں کے باعث ہجرت پر مجبور تھا۔ یہ قبیلہ کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں ارطغرل کی سربراہی میں موجودہ شام اور ترکی کے علاقوں کی طرف سفر کر رہا تھا کہ انہیں دو فوجی گروہ جنگ کرتے ہوئے نظر آئے۔ ارطغرل کے ساتھ کم و بیش چار سو جنگجو تھے۔ ان دو گروہوں میں سے ایک گروہ جو نسبتاً کمزور تھا اور شکست سے دوچار ہو رہا تھا ارطغرل نے بغیر ان کی پہچان کیے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور اپنے سپاہی لے کر میدان جنگ میں کود پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جنگ کا نقشہ بدل گیا اور کمزور اور شکست کے قریب گروہ میدانِ جنگ میں چھا گیا اور اس نے ارطغرل کی مدد کے باعث دوسرے گروہ کو شکست دے دی۔ اور بعد میں معلوم ہوا کہ کمزور گروہ اس وقت کے سلجوق حکمران علاؤالدین کا فوجی لشکر تھا جو منگول یا بازنطینی لشکر کے ساتھ بر سرِ پیکار تھا۔ یہ ساتھ ارطغرل کے لیے بہت خوش آئند ثابت ہوا اور سلطان ارطغرل کی اس خدمت سے بہت خوش ہوا اور انعام کے طور پر اسے سوغوت کا علاقہ عطا کیا جہاں بالا آخر قائی قبیلہ مستقل طور پر آباد ہو گیا۔ مگر یہ علاقہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں تھا۔ یہ ایک جنگی محاذ تھا جہاں ہر وقت مخالف گروہوں میں لڑائیاں اور جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ارطغرل کو بھی اپنی بقا کی خاطر بہت سی جنگیں لڑنا پڑیں۔ جس کے نتیجے میں اس سے سوغوت کے ارد گرد کے علاقوں سے بازنطینوں کو نکال باہر کیا اور اپنے علاقے کو وسعتیں دیتا چلا گیا۔ مگر ان جنگوں کا بھی کوئی تاریخی ثبوت تاحال میسر نہیں آسکا۔

مندرجہ بالا معلومات کی روشنی میں یہ ظاہر ہے کہ اس قدر محدود اور مختصر معلومات کے ساتھ ایک طویل ڈراما سیریل بنانا بغیر تحقیقی عوامل شامل کیے کیونکر ممکن ہو سکتا۔ لہٰذا اس کا زیادہ تر حصہ چاہے وہ واقعات پر مبنی ہو یا کردار نگاری پر تخلیقی فکشن پر مبنی ہے۔ اس کا مطالعہ تاریخی فکشن کے تناظر میں ہی کیا جانا چاہیے نہ صرف یہ کہ اس میں تاریخی واقعات اور کرداروں کو تخلیق کیا گیا ہے بلکہ ایک دو جگہ پر تاریخی حقائق کے بالکل بر عکس مناظر ہیں۔ مثلاً تیسرے سیزن میں ارطغرل اور بازنطینی کمانڈر دیسی لیوس کے درمیان جو جنگ دکھائی گئی ہے۔ اس موقع پر سلطان علاؤالدین عین اس وقت لشکرِ جرار کے سات ارطغرل کی مدد کو پہنچتا ہے اور عیسائیوں کو پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے یہ واقعہ بالکل غلط ہے کیونکہ تاریخ ہمیں بتاتی ہیے کہ یہ معاملہ بالکل اس کے بر عکس ہوا تھا۔ یہ ارطغرل اور اس کے سپاہی تھے جنہوں نے سلطان کی فوج کی مدد کر کے مسیحی فوج

کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگرچہ مورخین کے اس بابت بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ سلطان کی فوج کے مقابل مسیحی فوج تھی یا منگول مگر یہ بات متفقہ ہے کہ ارطغرل کی وجہ سے سلطان علاؤالدین کی فوج کو فتح نصیب ہوئی تھی۔ اور اسی فتح کے باعث سلطان کے سوغوت کے علاقے ارطغرل کو عطا کیے تھے۔

اس واقعے سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ فکشن نگار تاریخ کو کس نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے نزدیک اس کی تفہیم اور تشہیر کس کس زاویے سے کی جا سکتی ہے۔ فکشن نگار کس حوالے سے تاریخ کو زیادہ اہم سمجھتا ہے یا وہ ناظرین کو تاریخ کے کس پہلوؤں پر سوچنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔ وہ تاریخ کو کس طرح پیش کرنا چاہتا ہے۔ یوں وہ اپنے مقاصد اور نقطہ نظر کے مطابق آنے والی نسلوں کی ذہن سازی بھی کر سکتے ہیں۔ ڈرامے کا منظر نامہ تیرہویں صدی کا ہے، اسلامی ماحول پورے ڈرامے پر چھایا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور کامیابی کی وجوہات بنیادی موضوعات میں سے ہیں۔ اور ان تمام مسائل کا حل ایک شخص واحد پر قیاس کیا گیا ہے۔ وہ ہے اس ڈرامے کا ہیرو ارطغرل! گویا اگر آج بھی مسلمانوں میں ایک ایمان کامل رکھنے والا جذبہ جہاد سے سرشار کوئی ایک بہادر جواں مرد پیدا ہو جائے تو مسلمانوں کو زوال سے نکال کر عروج تک لے جایا جا سکتا ہے۔ ایک عظیم لیڈر سب سے بڑی اور اہم ضرورتِ وقت ہے۔ ایک ہیرو کے طور پر ابھرنے والا یہ مسلمان لیڈر سب کچھ ٹھیک کر سکتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

؎ آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا!

اور ہم بھول جاتے ہیں کہ نہ تو یہ انبیاء کا زمانہ ہے اور نہ ہی فراعین کا دورِ حکومت، تیرہویں صدی ہے اور نہ اس کے حالات! ہم اپنے تمام مسائل کا حل اس عظیم شخص میں تلاش کرنے کے متمنی ہوتے ہیں جو آگ کو گل و گلزار اور ناممکن کو ممکن کر کے چھوڑتا ہے کیونکہ فکشن نگار کا بنیادی منشا تاریخ کے اسی رخ کو ناظرین کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس لیے اس بات پر کیا بحث ہو سکتی ہے کہ ہم سب یعنی مسلمانوں کا یہ پسندیدہ موضوع ہے کہ اصل میں ہمارے زوال کی بڑی وجہ ہم میں موجود غدار ہیں۔ ہم بیرونی سازشوں کا شکار ہیں۔ اسلام دشمنی پوری دنیا کا پسندیدہ مشغلہ ہے اور ان تمام مسائل کا حل صرف اور صرف لیڈر رہے جو ہیرو جیسی صفات کا مالک ہو۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ اب اکیسویں صدی ہے۔ اس کے اپنے مسائل اور حل کے مختلف انداز ہیں۔ میدان جنگ کا نقشہ وہ

نہیں رہا۔ اب میڈیا وار کا دور ہے۔ ٹیکنالوجی کا دور ہے سائنس اور علم کا زمانہ ہے۔ اور سب سے اہم یہ کہ کوئی قوم بحثیت مجموعی اپنی سماجی حیثیت میں کس قدر مضبوط ہے؟ سماجی طاقت جسے ہم انفرادی قوت بھی کہہ سکتے ہیں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہر فرد ملت کے مقدر کو سنوارنے کی اہلیت پیدا کرے۔ افرادِ معاشرہ میں زیادہ تر افراد جدید تعلیم اور تربیت سے لیس ہوں۔ تمام شعبہ ہائے علم میں پروفیشنلز کی ایک معقول تعداد موجود ہو۔ تاکہ تمام شعبہ ہائے حیات کامیابی سے چلائے جاسکیں۔ کوئی شخص واحد اس زمانے میں واحد حل نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی لیڈر یا راہنما بھی ہو تو بھی وہ اپنی ٹیم جو کہ اپنے اپنے علوم و فنون میں ماہرین کی حیثیت میں کام کر رہی ہوتی ہے۔ کے ساتھ ہی کچھ کر سکتا ہے۔

خود ترکی میں جو موجود اسلامی لہر پیدا ہوئی ہے وہ محض حالیہ حکومت یعنی طیب اردگان حکومت کا کمال نہیں ہیں بلکہ کم و بیش ایک صدی پہلے سے ترکی میں فکری جدوجہد کی ایک تاریخ ہے۔ کمال اتاترک کی مذہب مخالف پالیسیوں اور احکامات کے باوجود ترکی میں مذہبی جوش اور دینی فکر اگر زندہ رہی تو اس کے پیچھے فتح اللہ گولن (پیدائش 1941) اور بدیع الزماں سعید نورسی 18.07.1960 جیسے علما اور مبلغ تھے جنہوں نے دینی فکر کو تحریکوں کی صورت پورے ملک میں پھیلایا۔ ان کی تبلیغ اور کوششوں کا رخ نوجوان بالخصوص وہ طلبا جو یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انہوں نے ترکی کی اشرافیہ، تاجر اور نوجوانوں کو مذہبی فکر سے دور نہیں ہونے دیا اور یہ کاوشیں تحریک کی صورت میں پورے ملک میں کام کرتی رہیں۔ اس کے نتیجے میں ترکی کے عوام میں مذہب بیداری کی ایسی فضا بندی کی جس میں ایک اچھی اور اسلام پسند قیادت کو کام کرنے کے مواقع میسر آئے۔ یہ قیادت ایک ماہر ٹیم اور اپنے حمایتوں کے بل بوتے پر کام کر رہی ہے۔ گویا پہلے مرحلے میں عوام بہ حیثیت مجموعی اپنے اخلاق و اعمال کو بہتر بناتے ہیں اور اس کے بعد ان کی قیادت سامنے آتی ہے جو ان تربیت یافتہ افراد کی مدد سے اپنی ریڑ قائم کرتی ہے۔ لہذا یہ باتیں صرف فکشن بالخصوص ڈرامے اور فلموں میں ہی ہو سکتی ہے کہ پورا معاشرہ جمود کا شکار ہو اور ایک شخص آکر ان کی تقدیر بدل ڈالے۔

پھر یہ کہ یہ دور جمہوری طاقتوں کا دور ہے۔ بادشاہ کو بھی جمہور کی رائے کا احترام کرنا پڑتاہ۔ کوئی قبائلی نظام تو اب ملکی سطح پر رائج نہیں کہ جہاں ایک سردار اپنے سپاہیوں کی مدد سے من چاہے فیصلے اور لڑائیاں کرتا پھرے اور اپنے سارے قبیلے پر نافذ کر دے۔ آج کے دور میں کوئی حکمران غاصبانہ طریقے سے اقتدار پر قبضہ کر

ے یا جمہوری دروازوں سے اقتدار کے ایوان میں داخل ہوا گر معاشرہ اس کا ہم نوا نہیں تو اس کا اقتدار قائم رہنا مشکل ہے۔ اس صورت میں اسے بہت سے فیصلے اپنی مرضی کے خلاف کرنے پڑتے ہیں۔ جگہ جگہ سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ پاکستان کا موجودہ جمہوری نظام اس کی ایک مثال ہے۔ مگر افسوس کہ ہمارے ہاں اور دوسرے ترقی پذیر ممالک میں لوگ ابھی تک ان حقائق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ معاشرے کو بہتر بنانے، علم و فن بالخصوص تحقیق کے میدان میں آگے بڑھنے، فکری اصلاح اور اخلاقی تربیت کرنے کی بجائے کسی بڑے لیڈر یا ہیرو کے انتظار میں بیٹھے ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہیں۔ یہاں اگر منتظرِ فردا کی بجائے "فرد" کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

تاریخ کے بارے میں ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ عظیم انسانوں کی داستان ہے۔ اپنی جگہ سہی مگر اس نظریے کی مخالفت میں بہت سے مضبوط نظریات موجود ہیں۔ بعض مفکرین کے نزدیک تع یہ عظیم لوگ بالکل عام لوگ ہوتے ہیں اور جب یہ مصروف عمل ہوتے ہیں تو دراصل انجانے میں فطرت کے منصوبو کی تکمیل کر رہے ہوتے ہیں۔ جب فطرت ان سے اپنے منصوبے پورے کرا لیتی ہے تو انہیں کوڑے کی ٹوکری میں ڈال دیتی ہے۔ مثلاً نپولین بوناپاٹ اور ایڈولف ہٹلر جنہوں نے یورپ کی تاریخ میں گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مگر جب ان دونوں کی ضرورت نہیں رہی تو دونوں کی زندگیوں کے آخری ایام نہایت بے بسی اور کسمپرسی میں گزرے۔ ٹالسٹائی کے نزدیک کے عظیم افراد یا جنہیں ہم ہیرو کہتے ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ بہت ہی ادبی سے لوگ ہوتے ہیں جو محض اس خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ وہ خاص ہیں مگر دراصل وہ اس قدر احمق ہوتے ہیں جنہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہیرو یا بڑا آدمی اس جانور کی طرح ہوتا ہے جسے ذبح کرنے یا قربانی کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہوتا ہے۔ اس کے گلے میں جو گھنٹی ہوتی ہے اس کے بجنے سے وہ یہ گمان کرتا ہے کہ پورا ریوڑ اس کی آواز پر حرکت کر رہا ہے اور وہ اس کا لیڈر ہے۔ مگر اس کا اصل کردار قربانی کا ہوتا ہے۔ مگر یہ لوگ یہ بات سمجھ نہیں پائے تاقتیکہ انہیں اپنی قربان گاہ تک پہنچ کر ختم ہو جانا ہوتا ہے۔

اس ڈرامے میں صرف ہیرو کو ہی نہیں نجات دہندہ دکھایا گیا بلکہ جو روحانی قوتیں اور خفیہ ادارے "ارطغرل" کی پشت پناہی کرتے نظر آ رہے ہیں وہ سب بھی افسانوی دنیا میں ہی ممکن ہے۔ ابن العربی اور ارتغرل کے مابین جس طرح پیر و مرشد کے تعلقات دکھائے گئے ہیں اس کی کوئی مستند دلیل یا ثبوت تاریخ سے

ہمارے ہاتھ میں نہیں آتا۔"ارطغرل" کوئی روحانی شخصیت نہیں بلکہ وہ ایک جنگجو ہے مگر اس کے پاس ایسی روحانی طاقتیں ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔اس کا مکمل طور پر ناکارہ ہاتھ جو(منگول کمانڈر نویان نے کیل ٹھونک دی تھی) بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے۔وہ کئی بار دنیا یا بالعموم اپنے تیئں جنگجوؤں کے ساتھ پورے لشکر کو پچھاڑ دیتا ہے۔اُسے ایسا زہر دیا جاتا ہے جس کا نہ تو تریاق ہے اور نہ موت سے فرار ممکن ہے مگر زہر دینے کے اگلے ہی دن ارطغرل نہ صرف مکمل صحت مند ہو جاتا ہے بلکہ دشمنوں پر حملہ کر کے انہیں نیست و نابود کر دیتا ہے۔ابن العربی بلاشبہ اسلامی تصوف کی کی فکری روایت کا ایک بہت بڑا اور معتبر نام ہیں مگر دو کشف و کمالات ان سے موسوم کیے گئے ہیں وہ محیر العقول ہیں۔اس طرح کے مناظر اور واقعات دکھانے کے پیچھے گویا یہ نظریہ ہے کہ تمام روحانی اور خفیہ طاقتوں کو اپنے لیڈرز کی مدد کرنی چاہیے۔

اس سلسلے میں قرآنی تعلیمات بالکل مختلف ہیں۔قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ کسی قوم کے عروج کے لیے بنیادی بات یہ ہے کہ وہ قوم بہ حیثیت مجموعی اپنی اصلاح کا کتنا جذبہ رکھتی ہے۔علمی اور اخلاقی لحاظ سے وہ قوم کس درجے میں ہے۔اگر اخلاقی رویے پست ہوں،علم سے بے بہرہ پن ہو، تو ایسی صورت میں قومیں کبھی عروج حاصل نہیں کر پاتیں۔اگر ان کے پاس اقتدار آ بھی جائے تو مستقل قیام نہیں کرتا۔بلکہ اس کے برعکس جو قومیں اخلاقی طور پر اعلی معیار کی حامل ہون اور علم تحقیق کے میدان میں آگے ہوں تو انہیں بہر حال قوموں کی امامت بھی سونپی جاتی ہے اور عزت و عروج بھی عطا ہوتا ہے۔لہذا اس دور میں ہیرو اور ہیرو پرستی کے جیسے جذبات کو فروغ دینے کی بجائے معاشرے کی مجموعی حالت بدلنے کی کوشش کی جانی چاہئیں۔معاشرے کی مجموعی قوت قوم کی تقدیر بناتی یا بگاڑتی ہے۔اس لیے قوم کی اخلاقی تربیت اور فکری بلاغت اور تطہیر جیسے کام کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔

## ب: "ارطغرل" کے تاریخ اور ڈرامے میں پیش کیے گئے کردار میں ارتباط و تفاوت کا مجموعی جائزہ

ہم نے تحقیقی موضوع کے تحت سابقہ صفحات میں تاریخ کے "ارطغرل" اور ڈرامے میں دکھائے جانے والے "ارطغرل" کے کرداروں پر تفصیلی بحث کی۔تاریخ میں موجود "ارطغرل" اس قدر غیر معروف شخصیت ہے کہ اگر یہ ڈرامانہ پیش کیا جاتا تو شاید اس ارطغرل کا نام بھی عوام کو معلوم نہ ہوتا۔سوائے چند تاریخ کے طالب علموں کے اس ارطغرل کے بارے میں کم لوگ جانتے ہیں۔مگر اس ڈراما سیریل کی بدولت آج "ارطغرل" نہ

صرف پاکستان میں ایک جانا پہچانانام ہے بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں ایک جانا پہچانانام ہے۔ بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں اس ارطغرل کی گونج سنائی دیتی ہے۔ پاکستانی ناظرین کا جو یہ حال ہے کہ اب وہ ارطغرل اور اس کے جنگجو ترگت، بامسی، دوغان کو اپنے ہیرو مانتی ہے۔ حلیمہ بھی خوابوں کی شہزادی جو شہزادی ہونے کے باوجود سخت محنت اور صبر ورضا کی زندگی بسر کرتی نظر آتی ہے۔ بہت سے نوجوانوں کی آئیڈل بن گئی ہے۔

ڈرامے میں "ارطغرل" کا کردار کسی داستان کے ہیرو کے کردار سے کم نہیں جو تلوار ہاتھ میں تھامے کفار کے دستوں میں چڑھ دوڑتا ہے اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا کشتے کے پشتے لگا دیتا ہے۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کفار کو شکست فاش دیتاہے اور اپنی فتح کا پرچم بلند کرتا ہے۔ اگرچہ ڈرامے میں علم کی اہمیت پر بھی بات کی گئی ہے۔ مگر اس کا غالب موضوع یہی ہے کہ اگر آج کا مسلمان جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر آوازِ حق بلند کرے تو ایک مسلمان ایک ہزار کفار پر برتری لے جاسکتا ہے اور اگر چند ایمان والے بہادر اکٹھے ہو جائیں تو پوری امتِ مسلمہ کا کھویا ہوا وقار بحال کر سکتے ہیں۔

اس طرح کی رومانوی باتیں شاید تیرہویں صدی میں تو ممکن ہوں مگر آج اکیسویں صدی میں بالکل غیر متعلق ہیں۔ آج ارطغرل جیسا ایک بہادر تو کیا سو بہادر بھی پیدا کر لیں جائیں تو مطلوبہ نتائج حاصل کرنے ناممکن ہوں گے۔ کیونکہ یہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ جو ملک ٹیکنالوجی بنا سکتا ہے وہی طاقتور اور مضبوط ہوتا ہے مگر افسوس مسلمان ابھی تک اس دنیا کے خواب دیکھتے ہیں جہاں چند نوجوان گھوڑوں پر سوار، ہاتھ میں الم اور تلواریں لیے دنیا کو فتح کرنے نکلتے ہیں اور کامیاب و کامران لوٹتے ہیں۔ اگرچہ جنگ کا میدان تو آج بھی برپا ہے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر ہمارے کسی حلقہ فکر کو ان باتوں کا خیال بھی ہے تو عملی میدان بالکل خالی پڑا ہے۔ ہماری درس گاہیں، علمی بدحالی، سائنس اور ٹیکنالوجی دوسری اقوام کی دریوزہ گری، معاشی کسمپرسی، صحت کے شعبے میں زبوں حالی، ہمارے ذہنی اور فکری رویوں کی پسماندگی ہمارے زوال کا باعث ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ ہر سال تعلیم کا بجٹ کم ہو جاتا ہے۔ ہماری جامعات تحقیق میں دنیا کا کیونکر مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اس طرح کی ہزاروں جامعات مل کر بھی شاید مغرب کی کسی ایک جامعہ کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہوں۔

ڈرامے کا مرکزی کردار "ارطغرل" بار بار اس بات کی طرف توجہ دلاتا نظر آتا ہے کہ عالم اسلام ہر طرف سے سازشوں میں گھرا ہوا ہے۔ غدار مکڑی کے جالوں کی طرح ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سازشوں اور

غداروں کو ختم کرنا ہی اصل کامیابی ہے۔ باقی ساری اقوام اخلاقی پستی اور بے راہ روی کا شکار ہیں اور چونکہ مسلمانوں کے پاس ایک عظیم ماضی، بہترین دین اور قوتِ ایمانی ہے اس لیے دنیا کو ہم سے یہ خطرہ ہے کہ اگر ہم نے خود کو مضبوط کر لیا تو پوری دنیا ہمارے قدموں تلے ہو گی۔ اس خوف کے مارے وہ مسلمان قوم کو وہ مضبوط نہیں ہونے دیتے۔ یہ قومیں اپنا سارا سرمایہ، ذہنی طاقت اور وقت اس منصوبہ بندی میں خرچ کرتی ہیں کہ کس طرح قوموں کو کمزور کیا جائے۔ لہذا وہ غداروں کی صورت میں ان میں پھوٹ ڈلواتے رہتے ہیں۔ یوں ہمیں بھی یہ یقین ہو جاتا ہے کہ دراصل اگر ہمارے درمیان غدار نہ ہوں تو ہم نا قابل شکست ہیں۔ ڈرامے میں یہ مناظر اس قدر تواتر اور تسلسل سے دکھائے گئے ہیں کہ ناظرین ان غیر حقیقی باتوں کو کسی حد تک حقیقت سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر دوسری طرف وہ مسلمانوں کی سادگی اور عمل سے محرومی کو ان کے زوال کی وجہ نہیں سمجھتے۔ اور یہ ڈراما دیکھنے کے بعد یہ بحث عام ہے کہ ہم پر مسلط قومیں ہم سے ہماری تہذیب اور ہیروز چھین لینا چاہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں "ارطغرل" جیسے ہیرو تلاش کر کے نوجوان نسل کو ان کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔ یوں تاریخ پر تحقیق اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والے حقائق پر توجہ کم سے کم اور افسانوی باتوں پر سارا زور لگا دیا جاتا ہے۔ جو لوگ اس ڈرامے کے مستقل ناظر ہیں آپ ان کے سامنے ارطغرل کے بارے میں کچھ غلط یا خلاف شان کہنے کی جسارت نہیں کر سکتے۔ ورنہ آپ کو اینٹی اسلام اور اینٹی مسلم قرار دینے میں ایک لمحہ نہیں لگے گا۔

دراصل اگر کوئی معاشرہ ذہنی، سیاسی اور معاشی طور پر پسماندہ ہو تو عام طور پر اسے ایسے ہیرو کی تلاش ہر وقت رہتی ہے جس کی ذات میں ذہانت، سیاسی بصیرت اور معاشی استحکام بدرجہ اتم موجود ہو۔ ایسا فرد اس قسم کے معاشرے میں بطور ہیرو پوجا جائے گا۔ ذولفقار علی بھٹو کی مثال اس طرح کے معاملے میں دی جا سکتی ہے۔ اگر ہم ہیرو پرستی کی نفسیات کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ برسرِ اقتدار قوتیں یا بادشاہ گر قوتیں اپنی مرضی کے فوائد یا مقاصد حاصل کرنے کے لیے مختلف طرح کے ہیرو بنا کر انہیں عوام کے سامنے پیش کرتی رہتی ہیں۔ پھر اگر برسر، اقتدار قوتیں مذہب پسند ہوں اور مذہبی خیالات کو معاشرے پر لاگو کرنا چاہیں تو ایسی صورت میں وہ کوئی مذہبی قسم کی شخصیت کو بطور ہیرو پیش کرتی ہیں۔ یوں ہیرو کی تشکیل ان کے مقاصد کے مطابق ہوتی ہے۔ معاشرہ جب علمی تنزل کا شکار ہو، میدانِ تحقیق شیر مردوں سے تہی پڑا ہو، سائنس اور ٹیکنالوجی کے دروازوں پر قفل لگا ہو تو ایسے میں پیش کردہ ہیرو ساری قوم کا اصل ہیرو بن جاتا ہے۔ عام طور پر یہ ہیروز زندہ نہیں ہوتا اسے تاریخ

کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے گھسیٹ کر لایا جاتا ہے تاکہ زیادہ اعتراض نہ اٹھ سکیں۔ یہ بات صرف مسلم معاشروں تک ہی محدود نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہیرو سازی ایک ایسا منصوبہ ہے جس کے تحت بہت سے مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ماضی کے ہیرو حال کے ولن اور حال کے ولن مستقبل کے ہیرو بن جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے تاریخ سے سبق سیکھنا قوموں کی ذمہ داری ہے مگر تاریخ کی حقیقت جاننا اور اسے کس انداز سے حال پر منطبق کیا جانا چاہیے یہ بھی اہم ہوتا ہے۔ اندھی تقلید اور بے تحاشا جذباتیت کے ساتھ تاریخی شخصیات کو اپنا قائد اور ہیرو بنالینا کوئی دانشمندی نہیں۔

ناظرین کو یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کوئی تاریخ نہیں بلکہ تاریخی فکشن ہے۔ اگر ہم اسے تاریخی فکشن کے طور پر دیکھیں گے تو یقیناً اس میں موجود کرداروں اور واقعات کے بارے میں جذباتی رویے نہیں اپنائیں گے۔ فکشن نگار آزاد ہے کہ وہ اپنے زورِ تخیل سے کسی کردار کو تاریخ کا درخشندہ ستارہ بنا دے اور کسے ایک غدار کے طور پر پیش کرے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی فکشن کے کردار نہ صرف تخلیقی ہوتے ہیں بلکہ کسی حد تک مافوق الفطرت بھی۔ ہیرو بھی اسی طرح کا ایک کردار ہوتا ہے۔ ساری کہانی اس کے اردگرد گھومتی ہے یہ ہر معاملے میں ایک مثالی کردار ادا کرتا ہے۔ ترقی یافتہ اقوام کے فکشن کے ہیرو بھی اسی طرح کے کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ لہذا ارطغرل غازی کا اصل تاریخ سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا ہر کولیس کا حقیقت سے۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ اگر تاریخی فکشن اصل تاریخ بیان کرے گا تو وہ فکشن کی بجائے تاریخ بن جائے گا۔

مندرجہ بالا تنقید سے مقصود یہ نہیں ہے کہ اس ڈرامے کو رد کر دیا جائے یا یہ تعلیم دی جائے کہ چوں کہ یہ غیر حقیقی واقعات و کردار پر مبنی ڈراما ہے لہذا اسے کھلا جھوٹ قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ اگر ہم فکشن اور تاریخ میں فرق کو سمجھتے ہوئے اور تاریخی فکشن کے لوازم کو جان لیں تو یقیناً اس ڈرامے کی خوبیاں ہم پر اور طرح سے کھلیں گی۔ اس ڈرامے کو بطور ایک تاریخی فکشن کے ہم اس سے زیادہ لطف اٹھا سکیں گے۔ لیکن اگر اسے تاریخ سمجھ کر اس سے کچھ نتائج اور سبق برآمد کریں گے تو یہ کوئی اچھی روایت نہیں ہو گی اور نہ ہی تاریخی فکشن کو اس طرز سے دیکھنا سود مند عمل ہو گا۔

## ج۔ نتائج

- موضوع زیر تحقیق ڈراما سیریل "ارطغرل غازی" کمرشل لحاظ سے ایک کامیاب ڈراما ہے۔ اس کی پیشکش کے پیچھے جو بھی محرکات ہوں، اسے ایک ڈراما بھی تخلیقی کاروائی سمجھ کر دیکھنا چاہیے نہ کہ اسے حال کے مسلمانوں سے جوڑ کر۔ انہیں اس بات کی ترغیب دلائی جائے کہ مسلمان جب تک تلوار ہاتھ میں تھامیں دشمنوں کا مقابلہ نہیں کریں، کامیاب نہیں ہوں گے۔ کیونکہ آج اکیسویں صدی میں یہ بات کسی طرح ممکن نہیں کہ تعلیم اور سائنس کے میدان میں ترقی کیے بغیر آپ کوئی عظیم خدمت سرانجام دے سکیں۔
- یہ تصور بجائے خود مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہے کہ ہمارے زوال کی سب سے بڑی وجہ غیر مسلم سازشیں اور غدار ہیں۔ قومیں دوسروں کی سازشوں سے تباہ نہیں ہوتیں بلکہ اپنی بدعملی، بداخلاقی اور سست الوجودی سے تباہ ہوتی ہیں۔
- فکشن ایک الگ صنف ہے اور تاریخ ایک علیٰحدہ میدانِ علم۔ ان دونوں کے مرکب سے بننے والا تاریخی فکشن جہاں بیک وقت تاریخ سے اپنا مواد حاصل کرے گا اور فکشن سے تخلیق سازی، وہیں ان دونوں سے سوا اور ماورا بھی قیاس آرائی اور تخیل سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھے گا۔ ہمیں ان باتوں کے فہم کے بعد ہی کسی تاریخی فکشن کو پرکھنا چاہیے۔

## د۔ سفارشات:

- محققین اور تحقیق کے طالب علموں کے لیے جہاں پاکستان جیسے ملک میں بہت ہی محدود اور کم وسائل ہیں وہاں بالخصوص ٹی وی اور فلم کے حوالے سے یہ سہولیات نہ ہونے کے مترادف ہیں۔ میں نے پی ٹی وی سے بار بار رابطہ کیا کہ کہیں سے اس ڈرامے کی ڈبنگ کی کاپی دیکھنے کو مل جائے۔ مگر وہان ایسا کوئی نظام موجود نہیں تھا۔ نہ ہی پی ٹی وی کی کوئی ایسی لائبریری موجود ہے جہاں طالب علم آزادانہ جا سکیں۔
- اس بات کی اشد ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ پبلک لائبریری کی طرز پر ٹی وی اور سینما کی لائبریریاں موجود ہوں جہاں تحقیق کرنے والوں کی رسائی ممکن ہو۔

- یہ دور Specialization کا دور ہے۔ کسی بھی شعبے میں ترقی کے لیے ہمیں ماہرین درکار ہوتے ہیں۔ شعبے ہائے زندگی اور شعبہ ہائے علم اس قدر وسعت اختیار کر چکے ہیں کہ کوئی ایک شخص ان سب کا ماہر نہیں ہو سکتا، نہ ہی کوئی تنہا شخص ان تمام مسائل پر قابو پا سکتا ہے۔ لہذا آج ہمیں کوئی ہیرو یا نجات دہندہ نہیں بلکہ ہر شعبے میں ماہرین کی اچھی تعداد تیار کرنی چاہیے۔ یہ تربیت یافتہ افرادی قوت ہر شعبے میں موجود ہو گی تو ملک مجموعی طور پر ترقی کر سکے گا۔
- فکشن ایک طاقتور ہتھیار ہے۔ اسے ذہن سازی کے لیے بہت اچھی طرح سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم سکرین کے توسط سے اپنی قوم کے ایسے افراد جو اپنے اپنے شعبوں میں انفرادیت رکھتے ہیں یا کوئی کمال دکھا رہے رہیں، اُن کو پیش کریں، ان کی زندگیوں اور کارناموں کو موضوع بنائیں تو ممکن ہے کہ نوجوان رومانوی داستانوں سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں اپنی صلاحیتوں اور محنت و عمل کے بل بوتے پر کچھ کر گزریں۔
- 70 کی دہائی کے بعد پاکستان میں تاریخی ڈرامے برائے نام بنائے گئے۔ تاریخی ڈراموں کی کم موجودگی کے باعث پاکستانی ٹی وی ناظرین کی وہ تربیت نہیں ہو سکی جس کی بنیادی پر وہ ان ڈراموں پر ٹھیک طرح سے نقد کر سکیں۔ لہذا تاریخی ڈرامے دیکھنے کی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ تاریخی ڈراموں کو پھر سے عام کیا جائے۔ اپنی تاریخ اور اپنے ہیروز پر مبنی تاریخی ڈرامے اس سلسلے میں اہم اور مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔
- تاریخی فکشن ایک صنف ہے جس کے استعمال پر قانون سازی کی جا سکتی ہے۔ تاکہ دوسری قوموں کے عقائد اور نظریات کو تعصب کی بھینٹ نہ چڑھایا جا سکے۔
- ہمارے ہاں بھی تاریخی فکشن، فلم اور ڈراما بنانے کے ادارے قائم ہوں۔ جہاں تحقیق کا ایک شعبہ ہو۔ نئی نسل کا تعلق اپنی تاریخ کے ساتھ جوڑا جائے اپنی تاریخ کو اپنی آنکھوں سے دنیا کو دکھایا جائے۔

# کتابیات

# بنیادی مآخذ

ارطغرل غازی (اردو) پی ٹی وی ہوم، سیزن 1
ارطغرل غازی (اردو) پی ٹی وی ہوم، سیزن 2
ارطغرل غازی (اردو) پی ٹی وی ہوم، سیزن 3
ارطغرل غازی (اردو) پی ٹی وی ہوم، سیزن 4
ارطغرل غازی (اردو) پی ٹی وی ہوم، سیزن 5
https://www.youtube.com/watch?v=fa89NxhAKis

# ثانوی مآخذ

## اردو کتب

ابن خلدون، عبد الرحمٰن، علامہ، تاریخ ابنِ خلدون، جلد اول، الفیصل، لاہور، 2008
ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، 2018
ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، 1980
احسن فاروقی، ڈاکٹر، تاریخ ادب انگریزی، کراچی یونیورسٹی بہ اشتراک مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1986
احمد خان، ڈاکٹر، قاضی عبد الستار، فن اور فنکار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2005
ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر، اردو فکشن کی تنقید، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، 1996
امتیاز علی تاج، انار کلی، انجمن ترقی اردو، دہلی، 1941
انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2019
اورنگزیب عالمگیر، ڈاکٹر، رئیس احمد جعفری، بک کارنر، جہلم 2007
حسین نصر، سید، تین مسلمان فیلسوف، محمد منور (مترجم) علاقائی ثقافتی ادارہ (آر۔سی۔ڈی) تہران، (لاہور) 1972
حمید اللہ شاہ ہاشمی، تاریخ ترکی، مکتبہ دانیال، لاہور، س ن
خلیل الرب، پروفیسر، تاریخ کا مطالعہ کیسے کیا جائے، دار الشعور، 2000

رشید احمد گوریجہ،ڈاکٹر،اردو میں تاریخی ناول ابلاغ،لاہور 1994
رشید احمد گوریجہ،ڈاکٹر،اردو میں تاریخی ناول،ابلاغ،لاہور،1999
سلیم اختر،ڈاکٹر،مغرب میں نفسیاتی تنقید،سنگِ میل پبلی کیشن،لاہور 2006
شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی،محمد شفیع بلوچ،دیباچہ محمد سہیل عمر مکتبہ جمال،لاہور،2001
عبدالحلیم شرر،فردوسِ بریں،دیباچہ و ترتیب،سید وقار عظیم،پروفیسر الفیصل لاہور،2007
عبدالحلیم شرر،ملک العزیز ورجنا،جے ایس سنت سنگھ اینڈ سنز،لاہور،س ن
لیو ٹالسٹائی،جنگ اور امن،فکشن ہاؤس،لاہور،2013
مبارک علی ڈاکٹر،تاریخ کی آواز،فکشن ہاؤس،لاہور،2004
محمد اسلم قریشی،ڈاکٹر،المیہ،ماورا پبلشرز،لاہور 1987
محمد عزیز،ڈاکٹر،دولتِ عثمانیہ،دارالمصنفین،شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،ہند،طبع جدید،2009
نجم الہدیٰ،ڈاکٹر،کردار اور کردار نگاری،بہار اردو اکیڈمی،پٹنہ،1980
نزہت سمیع الزماں،ڈاکٹر،تاریخ اور افسانہ،
نسیم حجازی،شاہین،جہانگیر بکس،لاہور 1948
وقار عظیم،داستان سے افسانے تک،بابر بک ایجنسی،دہلی،جون،1972

## اخبارات و رسائل

روزنامہ "جنگ"،10 مئی 2020
ریڈرز ڈائجسٹ،شمارہ 3،2013
ملت ٹائمز

## انگریزی کتب

Christiansen, Rupert, Romantic Affinities: Portratis From an age, 1780-1830,1989, cardinal ISBNO7474-0404-0

Fiction Dictionary & meaning, Cambridge English Dictionary, https://dictionary.cambridge.org/dictionary/english/fiction

Finkel, Caroline, Osman,S Dream, The Story of the Olloman Empire, 1300-1923, Baric books, 2005.

History of Islamic Philosophy by mayid Fakhiy, Columbia University Press, New York 1983, pg.253

http://alsharia.org/2006

http://www.oxfordlearners dictionaries.com

http://www.storyboardthat.com

https://www.britannica.com/dictionary/fiction#:~:text=Britannica%20Dictionary%20definition%20of%20FICTION,great%20works%20of%20fiction

https://www.oxfordlearns dictionaries.com

https://www.rekhta.org

https://www.youtube.com/watch?v=P5ieIbInFpg

Jack G. Shaheen, Reel Bad Arabs, Olive Branch Press, Jan 2001

James TOD, Annals and Antiquitiws of Rajast'han, George Rouhedge & sons limited London, 1914.

Poetics: chapter XIII? Sparknotes www.sparknotes.com

Stanzord Jay Shaw, Hostory of the Ottoman Empire and Modern Turkey, Cambridge University Press, 1976

TCk Publishing.com. 8 types of Heros in Fiction.

Thoams Carlyle, on Heroes, Hero-worship and the Heroic in History, University press new, London 2013

## انٹرنیٹ مآخذ


غرناطہ (فلم) https://www.youtube.com/watch?v=zzOguX1JKfg

جودھا اکبر (فلم) https://www.youtube.com/watch?v=zzOguX1JKfg

مغلِ اعظم (فلم) https://www.youtube.com/watch?v=e7hP9UNp0Hw

نپولین بوناپارٹ کے اقتباسات،

https://www.currentschoolnews.com/ur/quote/napoleon-bonaparte-quotes/

https://www.humsub.com.pk/

یونس ایمرے (راہ عشق) سیزن، 1، قسط 1، پی ٹی وی ہوم

https://www.youtube.com/watch?v=6ufrJgsIS70